إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مارچ ۲۰۱۹ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

قارئین کرام توجہ فرمائیں

ہم جانتے ہیں کہ البرہان کے اکثر قارئین اہل علم اور پڑھے لکھے افراد ہیں اور یہ کہ اس طرح کے لوگ بالعموم متوسط طبقے کے افراد ہوتے ہیں اور خود ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ جدید اور مذہبی تعلیم میں جس طرح کی اصلاح کے ہم علمبردار ہیں وہ اس کا کوئی تجربہ کرسکیں۔ لہٰذا قارئین سے درخواست ہے کہ وہ:

- اپنے اور اپنے حلقۂ احباب کے ذریعہ مالی طور پر خوشحال افراد سے رابطہ قائم کریں اور انہیں ہماری تجاویز کے مطابق نیا رول ماڈل سکول/ کالج/ یونیورسٹی یا دینی مدرسہ بنانے اور چلانے پر آمادہ کریں۔ یاد رہے کہ جدید تعلیم کے ادارے منافع بخش انداز میں بھی چلائے جاسکتے ہیں۔

- وہ ان افراد کو جو پہلے سے تعلیمی ادارے چلا رہے ہیں قائل کرنے کی کوشش کریں کہ اصلاح کے بغیر جدید نظامِ تعلیم فاسد اور مذہبی نظامِ تعلیم ناقص ہے لہٰذا وہ ہماری مشاورت سے ان کی اصلاح کی کوشش کریں۔

ہمتِ مرداں مددِ خدا

مدیر

ڈاکٹر محمد امین کی نئی تالیف

تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت

[تربیتِ طلبہ ہینڈ بُک و گائیڈ]

اس سوال کا واضح جواب کہ تعلیمی اداروں میں طلبہ وطالبات کی اسلامی تربیت کیسے کی جائے؟

صفحات 160 سائز 20x30x8 قیمت: 300 روپے

سکولوں کے لیے خاص رعایت

ملنے کا پتہ

کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور، فون نمبر: 0321-8836932

مکتبہ البرھان، A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،

فون نمبر: 0300-4354673

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

❁ تدریس القرآن ① برائے معلمین	۱۹۰ صفحات
❁ تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات	۷۲
❁ تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک وگائیڈ	۱۶۰
❁ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
❁ ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
❁ تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۰
❁ اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
❁ نصابِ مدنیؒ	۴۰
❁ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
❁ حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۰
❁ ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۵۰
❁ مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۳۰۰
❁ اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۵
❁ اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۵
❁ عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۷۰

ڈسکاؤنٹ سمیت
بدون ڈاک خرچ

کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور، فون نمبر: 0321-8836932
مکتبہ البرہان، 97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،
فون نمبر: 0300-4354673

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۳، شمارہ ۳، مارچ ۲۰۱۹ء/ جمادی الثانی ۱۴۴۰ھ

مشمولات

O فکر و نظر

عدل کے نام پر عدل کا قتل | مدیر | ۴

O تعلیم و تربیت

۔ تعلیم کی مایوس کن صورتِ حال | پروفیسر ملک محمد حسین | ۶

۔ 'تعلیم کے تناظر میں 'روحِ عصر' کی مزاحمت حماقت یا عزیمت؟ | ڈاکٹر محمد امین | ۱۰

۔ جدید تعلیمی ادارے اسلامی اقدار کو تبدیل اور تباہ کر رہے ہیں؟ | سید خالد جامعی | ۱۵

۔ دینی مدرسہ برائے تعلیم عوام ایک نئی اپروچ | مدیر | ۲۷

۔ دینی مدارس اور تجدد | پروفیسر طارق بٹ | ۳۳

۔ حکومت پنجاب کی نئی پانچ سالہ تعلیمی پالیسی | پروفیسر ملک محمد حسین | ۳۴

۔ ہم اُردو کا حلیہ بگاڑنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ | مدیر | ۳۶

O اسلام اور پاکستان

۔ کیا پاکستان کا عدالتی نظام اسلامی ہے؟ | ۳۷

۔ واقعۂ ساہیوال ۔ 'سی ٹی ڈی' کو ختم کیا جائے | مدیر | ۴۰

۔ سیاحت اور ثقافت کا فروغ ۔ مگر کس قیمت پر | ۴۲

O تفہیم مغرب

اسٹیفن ہاکنگ کے نظریات کا تنقیدی جائزہ | پروفیسر محمد رفعت | ۴۴

O کس قیامت کے یہ نامے

مولانا مودودیؒ کی فکر کے حوالے سے قارئین اور مدیر میں مکالمہ | ادارہ | ۵۶

فکر و نظر

آسیہ مسیح کیس

عدل کے نام پر عدل کا قتل

جنابِ چیف جسٹس! فیصلہ میرٹ پر نہیں ہوا

۲۹ جنوری ۲۰۱۹ء کو سپریم کورٹ آف پاکستان نے آسیہ مسیح کی بریت کے خلاف نظر ثانی اپیل چیف جسٹس آف پاکستان کی سربراہی میں سنی اور مسترد کر دی۔ چیف جسٹس صاحب نے فرمایا کہ ہم نے فیصلہ میرٹ پر کیا ہے۔

گستاخی معاف جناب عالی! فیصلہ میرٹ پر نہیں ہوا۔ ہم نے دسمبر ۲۰۱۸ء کے البرہان میں دلائل سے ثابت کیا تھا کہ فیصلہ میرٹ پر نہیں ہوا۔ دوسرے ہزاروں اہل علم نے بھی یہی کہا اور لکھا بلکہ کروڑوں پاکستانیوں کی رائے یہی ہے لیکن....

عزت مآب! آپ نے مغرب کا قانون پڑھا، ساری زندگی اس کی پریکٹس کی، اس کی تفہیم و تشریح کی....

راقم نے 'اسلامی قانون' پڑھا، اس میں پی ایچ ڈی کی اور ساری عمر اس کی تفہیم و تدریس میں گزاری....

آپ اس وقت چیف جسٹس آف پاکستان ہیں لہٰذا آپ کی رائے 'فیصلہ' اور 'قانون' ہے اور وہ نافذ ہوگی جب کہ میرے دلائل میں کوئی وزن نہیں کیونکہ مَیں دو ٹکے کا پروفیسر اور مصنف ہوں۔

عزت مآب! پاکستان کی عدلیہ، پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ ہے اور پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ عالمی اسٹیبلشمنٹ کا ایک جزو۔ دنیا پر عالمی اسٹیبلشمنٹ کی حکومت ہے۔ مغرب کی فکر، تہذیب اور قانون اس وقت غالب ہے اور وہ سکہ رائج الوقت ہے جبکہ 'اسلامی قانون' بے وقت کی راگنی ہے اور اسلامی قانون کے ماہرین آثار قدیمہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

لیکن

عزت مآب! کیا تاریخ کے اس جبر سے، نظام کے اس جبر سے 'حق' بدل جاتا ہے۔ کیا

سچ جھوٹ بن جاتا ہے اور جھوٹ سچ ؟

نہیں عزت مآب ! آپ کی دنیا میں بھی ایسا نہیں ہوتا....آج سے صدیوں پہلے ایک شخص نے اپنے وقت کی عدالت عالیہ کا فیصلہ مان کر زہر پی لیا تھا لیکن اس سے جھوٹ سچ نہیں بن گیا تھا۔ دنیا آج بھی جانتی ہے کہ سچ کیا تھا اور جھوٹ کیا!

لیکن

اگر ایسا نہ بھی ہو تو....

ایک دن آئے گا جب عدالت لگے گی....آپ کی عدالت سے بڑی عدالت.... بلکہ سب سے بڑی عدالت۔

اس دن عدل ہوگا، صرف عدل اور ذرا بھی بے انصافی نہ ہوگی۔

لیکن وہ عدالت ذرا وکھری ٹائپ کی عدالت ہوگی۔ وہ دلوں کے بھید اگلوا لے گی اور دماغ کے جھوٹ پکڑ لے گی! اس دن ہاتھ بولنے لگیں گے اور ٹانگیں گواہی دینے لگیں گی۔

اس دن نہ کوئی چیف جسٹس ہوگا نہ وزیر اعظم، نہ آرمی چیف، نہ پاکستان کی حکومت اور نہ سپر پاور امریکہ و یورپ اور نہ مغربی تہذیب کا غلبہ۔ اس دن بس ایک خدا کی بادشاہی ہوگی اور اس کا انصاف ہوگا۔

اے اللہ! آصف سعید کھوسہ کو اور مجھے اور سارے مسلمانوں کو بلکہ سارے انسانوں کو اس دن کی رسوائی، ذلت اور عذاب سے بچا۔ آمین، یا ربّ العلمین.

پس نوشت

ہاں! اس دن آصف سعید کھوسہ اور محمد امین ہی نہیں وہ علماء اور سیاسی و دینی زعماء بھی جواب دہی کے لیے کھڑے ہوں گے جو آج اپنے اپنے مسلکی، سیاسی، مالی اور دنیوی مفادات کو دینی مفادات پر ترجیح دے رہے ہیں، اخلاص و فراست کو تج کر، فرقہ واریت اور بے حسّی کی چادر اوڑھ کر اور اسٹیبلشمنٹ، حکمرانوں اور خفیہ ایجنسیوں کے آلۂ کار بن کر دین کی مغلوبیت کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس دن کی رسوائی سے محفوظ رکھے۔ آمین

تعلیم و تربیت پروفیسر ملک محمد حسین

تعلیم کی مایوس کن صورتِ حال

پاکستان جب آزاد ہوا تو وطن عزیز میں شرح خواندگی ۱۹.۸ فیصد تھی۔ اب ۷۲ سال بعد شرح خواندگی ۵۸ فیصد بتائی جارہی ہے یعنی آزادی سے اب تک شرح خواندگی میں ۳۸ فیصد اضافہ ہوا جو اوسطاً سالانہ تقریباً نصف فیصد ہے۔ اسّی کی دہائی میں شرح خواندگی میں سالانہ اوسط اضافہ ایک فیصد تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسّی کی دہائی کے بعد شرح خواندگی کے اضافہ میں کمی واقع ہوئی حالانکہ اس دَور کی حکومتیں تعلیم کی بہتری کے لیے بلند بانگ دعوے کرتی رہی ہیں۔ اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں کمی واقع ہوئی جب کہ پرائیویٹ سیکٹر میں تعلیمی ادارے بڑھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی سہولتیں اور تعلیمی مصارف آبادی میں اضافے کا ساتھ نہ دے سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شرح خواندگی میں سالانہ اوسط اضافہ نصف رہ گیا۔

شرح خواندگی کو ایک طرف رکھتے ہوئے اگر سکولوں میں بچوں کے شرح داخلہ پر نظر ڈالیں تو اگرچہ پڑھنے والے بچوں کی تعداد میں تو اضافہ ہوا ہے لیکن انرولمنٹ ریٹ یعنی شرح داخلہ میں کمی واقع ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً اڑھائی کروڑ بچے سکولوں میں داخلہ سے محروم رہے ہیں۔ دورِ حاضر میں جہاں اکثر وبیشتر ممالک شرح خواندگی اور شرح داخلہ کے سو فیصد ہدف تک پہنچ چکے ہیں وہاں پاکستان گزشتہ صدی کی اسّی کی دہائی کی صورتِ حال سے تنزل کی طرف جاتا نظر آتا ہے۔ سکول ایجوکیشن میں معیارِ تعلیم کی کیفیت بھی حوصلہ افزا نہیں ہے۔ امتحانی بورڈز کے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے نتائج کے گراف تو بہتری کی نشاندہی کرتے ہیں اور بسا اوقات طلبہ کے فیصد حاصل کردہ نمبر ہوش ربا حد تک بلند نظر آتے ہیں لیکن حقیقی علمی تحصیل (Educational Achievement) مطلوبہ معیار سے کوسوں دور ہے۔ زباندانی کی کیفیت بہت کمزور ہے جس کے نتیجہ میں دیگر مضامین کا فہم بہت نچلے درجے پر رہتا ہے۔ رَٹہ بازی پر زور کی وجہ سے اور امتحانی سوالوں کی نوعیت کے پیشِ نظر حاصل کردہ نمبر

بڑے ہندسوں میں نظر آتے ہیں لیکن علم کے فہم و اطلاق کی صلاحیت نشوونما نہیں پاتی۔ معیارِ تعلیم کے متعلق کہی گئی اوپر کی باتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہم بچوں کا امتحان لینے میں بھی خاطر خواہ بہتری نہیں لا سکے۔ چند عشرے پہلے اس امر پر غور و فکر ہوتا تھا کہ ہمارا امتحانی نظام کمزور ہے اور اس میں اصلاح کی ضرورت ہے لیکن اب ہر طرف اطمینان نظر آتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سارا نظام بیوروکریسی اور نان پروفیشنل تعلیمی کارکنان کے ہاتھوں میں ہے اور دنیا میں ہونے والی تعلیمی جائزہ پیمائش کی تحقیقات سے کوئی واقف نہیں ہے۔ لہٰذا تبدیلی اور بہتری کا احساس بھی جنم نہیں لیتا۔ لے دے کے اے لیول اور او لیول کے امتحانات ہمارے آئیڈیل ہیں اور کبھی کبھی فیصلہ ساز یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ہم کیمبرج کی طرح کا نظامِ امتحان رائج کریں گے۔

پاکستان تحریک انصاف کی موجودہ حکومت یکساں نظامِ تعلیم اور یکساں نصابِ تعلیم کا نعرہ لے کر اقتدار میں آئی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نعرہ تو تھا وژن نہیں تھا۔ تعلیم کے شعبے میں کوئی مردِ کار پی ٹی آئی کے پاس نہیں ہے۔ بس جناب شفقت محمود صاحب ہیں اور وزارتِ تعلیم کی بیوروکریسی جو سبق انہیں پڑھا دیتی ہے اُسی کا اظہار وہ فرما دیتے ہیں۔ طبقاتی نظامِ تعلیم ہمارے معاشرے میں تہہ در تہہ اس طرح پیوست ہے کہ گہری سوچ بچار کے ساتھ عزم صمیم ہو گا تو شاید کچھ کیا جا سکے ورنہ ایچیسن کالج، برن ہال کالج، صادق پبلک سکول، کیڈٹ کالجز، آرمی پبلک سکولز، بیکن ہاؤس سکولز، شوئیفات سکول، سٹی سکولز، دیہات میں قائم ٹاٹ سکولز اور دینی مدارس کا وسیع نیٹ ورک ہوتے ہوئے محض بیان بازی سے یکساں نظامِ تعلیم کا خواب دیکھنا محض خواب ہی ہو سکتا ہے، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ موجودہ حکومت نے اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں کیا اور نہ ہی توقع ہے کہ کچھ کر پائیں گے۔

اس حکومت سے توقع تھی کہ تعلیم کے شعبے میں بجٹ میں اضافہ کرے گی لیکن ہو یہ رہا ہے کہ پہلے سے موجود بجٹ کو بھی روکا جا رہا ہے۔ جیسی بدحالی باقی شعبوں میں نظر آ رہی ہے اس سے زیادہ تعلیم کے شعبے میں کارفرما نظر آتی ہے۔

ایک طرف حکومت کی نااہلی ہے تو دوسری طرف نیب کی چیرہ دستیاں ہیں۔ بہاؤالدین

زکریا یونیورسٹی ،ولی خان یونیورسٹی ، پنجاب یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف سرگودھا کے وائس چانسلروں اور بعض دیگر افسران کے خلاف نیب کے اقدامات نے ہائر ایجوکیشن کے شعبے میں دہشت کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔شاید کہیں بے اعتدالیاں بھی ہوئی ہوں گی لیکن جو نارواطریقہ نیب نے اختیار کیا ہے اس نے پورا ماحول ہی خراب کر دیا ہے۔ ہمارے ذاتی علم کی حد تک سرگودھا یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور سابق رجسٹرار نے کوئی کرپشن نہیں کی ،شاید ان کے فیصلوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن نیک نیتی سے کیے گئے ایسے فیصلے جو نتائج کے اعتبار سے غلط ثابت ہوں ،اخلاقاً اور قانوناً قابل گرفت نہیں ہوتے۔خود نیب والے بھی تو کتنے بے گناہ لوگوں کو پکڑ لیتے ہیں اور انہیں بے عزت ، بے وقار کرنے کے بعد تفتیش کے نتیجے میں چھوڑ دیتے ہیں تو کیا نیب کے چیئر مین اور دیگر سینئر افسران کو ہتھ کڑیاں لگائی جائیں گی کہ انہوں نے غلط انتظامی فیصلہ کیا۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ نیب نے جامعات کے ذمہ داروں کے خلاف غیر ذمہ دارانہ ایکشن لے کر نہ صرف محترم شخصیتوں کو بے وقار کیا ہے بلکہ تعلیم کو ہی بے وقار کر کے رکھ دیا ہے۔سرگودھا یونیورسٹی جو معیار اور ماحول کے حوالے سے بہت خوبی کی طرف جارہی تھی اب تیزی کے ساتھ تنزل کی طرف جارہی ہے۔انتظامی طور پر تباہ حالی کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی ماحول بھی بہت خراب ہوا ہے۔ہم پھر کبھی اس پہلو سے تفصیل سے بات کریں گے اب صرف اشاروں پر ہی قناعت کرتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی خوش قسمت ٹھہری کہ اُسے ڈاکٹر نیاز احمد اختر کی شکل میں ایک قابل دیانتدار اور پُرعزم وائس چانسلر میسر آ گیا۔موجودہ حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد بعض دیگر جامعات بحران کا شکار ہیں خاص طور پر لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی مستقل وائس چانسلر سے محروم ہونے کے باعث انتظامی طور پر مشکلات کا شکار ہے۔عزت مآب چیف جسٹس (ریٹائرڈ) ثاقب نثار صاحب نے بلاوجہ ہی اس یونیورسٹی کو بحران کا شکار کر دیا۔حکومت کے انتظامی فیصلوں میں عدالتوں کی بڑھی ہوئی مداخلت اداروں کو مسائل کا شکار کر دیتی ہے۔

ہائر ایجوکیشن میں معیار اور ڈسپلن کی کمزوریاں ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں یونیورسٹیوں اور ڈگری اوارڈنگ انسٹی ٹیوٹس کی کمی نہیں ہے۔اگر کمی ہے تو معاشرے کی ضروریات اور پاکستان کے نظریہ کی روشنی میں تعلیم اور تحقیق کی کمی ہے۔ازکار

رفتہ مغربی فکر پر مبنی کتب اور موادِ تعلیم ہماری ہائر ایجوکیشن کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری جامعات اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے خود کار جہالت (Perpetual Ignorance) کا شکار ہیں۔ جدّت، ندرت اور مقامی ضروریات ونظریات کے تقاضے کسی کے پیش نظر نہیں حتیٰ کہ اسلامیات واُردو جیسے مضامین میں بھی معاشرے کی افادیت کے حامل موضوعات ناپید ہیں۔ جامعات میں قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں کا ایک کلچر کارفرما نظر آتا ہے لیکن تحقیقی موضوعات اور تنوع کی طرف توجہ نہیں ہے بس خانہ پُری ہے جو ہائر ایجوکیشن کے اساتذہ اور ریسرچ سٹوڈنٹس کے لوازمات پوری کرتی ہیں۔

کوئی بھی نظامِ تعلیم اپنے اساتذہ کے معیار سے بلند نہیں ہوسکتا لیکن ہمارے اساتذہ خصوصاً سکول اساتذہ کا پیشہ ورانہ معیار بہت خراب ہوا ہے۔ پہلے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی بربادیاں پھیلا رہی تھی اور اب پچھلے دوعشروں سے یونیورسٹی آف ایجوکیشن اس سلسلہ میں قائدانہ رول اختیار کرگئی ہے۔ ہم نصف صدی سے ٹیچر ایجوکیشن کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے یونیورسٹی آف ایجوکیشن کا مطالبہ کررہے تھے اور جب یہ مطالبہ پورا ہوا تو پتہ چلا کہ یہ تو ٹیچر ایجوکیشن کی جڑیں کاٹنے والا منصوبہ ثابت ہوا۔ یونیورسٹی کی باگ ڈور پہلے ہی دن سے نان پروفیشنل انتظامیہ کے ہاتھ میں آگئی نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی آف ایجوکیشن تربیت اساتذہ کے علاوہ سارے کام کرتی ہے بس ٹیچر ایجوکیشن اس کے ایجنڈے سے باہر ہے۔

ہم نے مختصر الفاظ میں اور ذرا سہمے انداز میں تعلیم کی زبوں حالی کا ماتم کیا ہے لیکن کیا صرف ماتم ہی کافی ہے یا کچھ ایسے اقدامات کی بھی ضرورت ہے جس سے تعلیم کا شعبہ ترقی کی طرف گامزن ہو، اس پر البرہان کے اگلے کسی شمارے میں ہم اپنی معروضات پیش کریں گے، ان شاء اللہ۔

تعلیم و تربیت　　　　ڈاکٹر محمد امین

تعلیم کے تناظر میں

'روحِ عصر' کی مزاحمت - حماقت یا عزیمت؟

اگر 'روحِ عصر' کفر و الحاد پر مبنی ہو تو 'اظہارِ دین' کا تقاضا ہے کہ اس کے خلاف بغاوت کی جائے

۱۔　کچھ دن پہلے ایک دوست سے ملاقات ہوئی جو تعلیمی معاملات میں ہمارے ہم خیال ہیں۔ وہ کئی سالوں سے اسلامی تقاضوں کے مطابق ایک کالج چلا رہے تھے۔ بالآخر خسارہ برداشت نہ کر سکے اور انہیں کالج بند کرنا پڑا۔ ان کا کہنا تھا کہ دوسرے لوگ تو رہے ایک طرف، خود دین دار لوگ بھی اپنی بچیوں کو ایسے کالجوں میں بھجواتے ہیں جہاں مخلوط تعلیم ہے، اسلامی تربیت موجود نہیں بلکہ گلیمر اور فیشن کی اجازت اور لبرل (کھُلّا ڈُلّھا) ماحول ہے۔

۲۔　پچھلے ہفتے تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ کے دفتر میں سکولوں کے لیے اسلامی نصاب کتب تیار کرنے کے حوالے سے مشاورت ہوئی۔ برادرم پروفیسر ملک محمد حسین صاحب کا کہنا تھا کہ 'مارکیٹ' کی ضرورت یا مجبوری یہ ہے کہ پہلے مرحلے میں نصابی کتابیں پری سکول (Pre-School) کے لیے تیار کی جائیں اور وہ انگلش میڈیم میں ہوں۔ مَیں نے کہا کہ ہم تو آج تک انگلش میڈیم کی مخالفت کرتے آئے ہیں بلکہ ہم تو پری سکول میں انگلش زبان کی تدریس کو بھی غیر سائنٹفک اور نظریاتی حوالے سے غیر موزوں قرار دیتے آئے ہیں بلکہ پری سکول میں تین لیول (پلے گروپ، نرسری اور پریپ) اور ہر لیول کے لیے تین چار کتابوں کے خلاف بھی لکھتے رہے ہیں۔ ملک صاحب نے کہا کہ جب اُردو میڈیم سکول موجود ہی نہیں (اگرچہ پنجاب حکومت ان کے قیام کی اجازت دے چکی ہے) تو آپ نصابی کتابیں کس کے لیے لکھیں گے اور انہیں کون خریدے گا؟ اسی طرح پری سکول اب 'مارکیٹ' کی مجبوری ہیں کیونکہ پاکستانی معاشرے میں اب مائیں بچے کو پانچ سال کی عمر تک گھر میں رکھ کر ان کی تربیت کرنے کو تیار نہیں۔ وہ رات کو ٹی وی پر ڈرامے یا فلمیں دیکھتی ہیں، دن میں سوتی ہیں اور دوسری سرگرمیوں (؟) میں مصروف ہوتی ہیں لہٰذا تین سال کے بچے کو سکول (پلے گروپ میں) بھجوا دیتی ہیں۔ یوں سمجھیے کہ یہ باتیں اب 'روحِ عصر' ہیں۔ ان کی مخالفت کر کے 'مارکیٹ'

میں زندہ نہیں رہا جاسکتا۔ ہم نے کہا کہ ہم لنڈورے ہی بھلے۔ تو ملک صاحب کہنے لگے کہ پھر سیکولر اور لبرل ذہن کے لوگ نصابی کتابیں لکھیں گے اور مسلمان بچوں کی غیر اسلامی تربیت کریں گے۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی حل نہیں کہ ہم نصابی کتابیں لکھیں، مجبوراً انگریزی میں لکھیں اور ان میں جہاں تک ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ اسلامی تناظر کا خیال رکھیں۔

۳۔ قارئین البرہان جانتے ہیں کہ ہم مغرب کی (سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ) جمہوریت کے خلاف ہیں اور اس کے بارے میں البرہان میں لکھتے رہتے ہیں۔ ہماری رائے کے خلاف کوئی لکھے تو اسے بھی موقع دیتے ہیں۔ البرہان میں ایک صاحب کبھی کبھار لکھا کرتے تھے محمد رشید صاحب (ملتان والے)، انہوں نے لکھا کہ جمہوریت آج کی 'روحِ عصر' ہے اس کی مخالفت کا کوئی جواز نہیں۔ ہم نے اس کی بھی زوردار مخالفت کی۔ وہ اتنے بدمزہ ہوئے کہ انہوں نے البرہان میں لکھنا ہی چھوڑ دیا (محمد رشید صاحب! البرہان کے لیے لکھا کیجیے۔ ہم آپ کے اختلاف رائے کو برداشت کریں گے)۔ اسی تناظر میں ہم 'اسلامی بنکنگ' کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔

۴۔ قارئین کرام! ہمارا موقف یہ ہے کہ 'روحِ عصر' اگر کفر والحاد پر مبنی ہو یا کفر والحاد کی پیداوار ہو تو ہمیں اس کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے، اس کی مزاحمت کرنی چاہیے بلکہ اس کے مقابلے میں اسلامی علمیت پر مبنی اداروں کی تجدید اور تشکیلِ نو کی سعی کرنی چاہیے۔ یہ دین پر عمل اور 'اظہارِ دین' کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر ہم یقین رکھتے ہیں کہ اسلام اللہ کا سچا دین ہے جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو میں ہماری رہنمائی فرماتا ہے تو پھر ہم غیرِ اسلام کی دریوزہ گری کیوں کریں؟ کیا صرف اس لیے کہ مغرب آج غالب ہے اور اس کی الحادی فکر وتہذیب کا آج ہر سُو غلبہ ہے اور اس نے اپنے ہمہ جہت غلبے سے اور اپنی پروپیگنڈا مشینری کے زور پر اپنی جمہوریت کو 'روحِ عصر' بنا دیا ہے؟ اور کیا ہم تعلیم میں مغربیت، انگریزی زبان کے غلبے اور مغربی علوم کی بالادستی کو محض اس لیے قبول کرلیں کہ مغرب نے اپنے سیاسی، تعلیمی، حربی غلبے اور پروپیگنڈے کے زور پر اسے 'روحِ عصر' بنا دیا ہے؟ ہرگز نہیں! ہم اگر اپنا ایک نظریۂ حیات رکھتے ہیں، اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور اسے غالب دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہم مجبور ہیں کہ ہر غیر اسلامی نظریۂ حیات کو (جسے کفر نے اپنی طاقت سے 'روحِ عصر' بنا دیا ہے) ردّ کردیں، اس

سے بغاوت کریں، اس کی مزاحمت کریں اور اس کی بجائے اپنے نظریۂ تعلیم، اپنے نظریۂ سیاست، اپنے نظریۂ کلچر.... پر عمل کرنے کی اور اسے غالب کرنے کی کوشش کریں۔

مفاہمت، سمجھوتے (Reconciliation) اور ’روحِ عصر‘ کے نام پر غیرِ اسلام اور اس کے غلبے اور اس کی فکر، تصورات اور اداروں کو قبول کر لینا ابن الوقتی اور دوں ہمتی ہے، حکمتِ عملی نہیں۔ یہ ’چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی‘ کے مقولہ پر عمل کرنا ہے۔ یہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرنے کا آسان نسخہ بلکہ بہانہ ہے۔ صحیح راہِ عمل وہی ہے جس کی نشان دہی اقبال نے کی تھی کہ ؎

میا را بزم بر ساحل کہ آں جا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

یعنی جواں مردی یہ ہے کہ بہاؤ کے خلاف تیرا جائے۔ ’روحِ عصر‘ اگر آپ کی منزل کھوٹی کرنے والی ہے تو اسے جوتے کی نوک پہ رکھا جائے۔ لیکن اس کے لیے ایمان کی قوت درکار ہے۔ جب ایمان پختہ ہو اور فکر و عمل میں ڈھل چکا ہو تو آپ دریا میں بھی گھوڑے ڈال دیتے ہیں۔ اور اگر غیرت ایمانی زندہ نہ ہو تو آپ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر لہریں ہی گنتے رہیں گے۔ پھر کوئی ’عبداللہ‘ جب اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو ڈبڈباتی آنکھوں سے حسرت سے دیکھتا ہے تو غیرت مند ماں کو کہنا پڑتا ہے کہ ’جس سرزمین کی تم مردوں کی طرح حفاظت نہیں کر سکے، اس کے کھونے پر عورتوں کی طرح ٹسوے کیوں بہاتے ہو؟‘۔

سو برادرانِ عزیز! اگر آپ کو اپنے دین پر عمل مقصود نہیں، اس کا غلبہ مقصود نہیں، اگر اس کے لیے آپ ایثار نہیں کر سکتے، اس کے لیے قربانی نہیں دے سکتے، اس کے لیے لڑ نہیں سکتے تو اللہ کا دین ایسے بزدلوں کی حمایت سے بے نیاز ہے۔ وہ کسی اور قوم کو کھڑا کر دے گا۔ آپ جایئے اور کفر سے سمجھوتہ کیجیے اور اس کی ’روحِ عصر‘ کو اپنایئے۔ لیکن خدارا اسلام کا نام لینا چھوڑ دیجیے کہ یہ بزدلوں اور دوں ہمت لوگوں کا دین نہیں، یہ منافقوں کا دین نہیں۔ یہ ان لوگوں کا دین ہے جن کے ایک فرد کو سینے میں نیزہ لگا اور وہ اس کے آر پار ہو گیا تو اس نے گرتے ہوئے کہا [illegible] یعنی ربّ کعبہ کی قسم! مَیں کامیاب ہو گیا گویا ؎

جس کو ہوں جان و دل عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں؟

لیکن اگر آپ کو اپنا مالی مفاد آخرت سے عزیز تر ہے اور آپ اپنے سکولوں میں مسلمان بچوں کو مغربی فکر و تہذیب پر مبنی تعلیم دے کر انہیں فکری غلامی کا درس دینے پر مجبور ہیں تو پھر دنیا میں غلامی کی ذلت ورسوائی کے لیے بھی تیار رہیے اور آخرت میں اللہ ورسول کے سامنے شرمندگی اور ذلت اٹھانے کے لیے بھی۔

۵۔ یہ بھی واضح رہے کہ 'روح عصر' کا موثر جواب اجتماعی قوت سے اور ایک متبادل 'روحِ عصر' ہی سے دیا جاسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کا آغاز ایک فرد ہی سے ہوگا لیکن ناگزیر ہے کہ افراد ملتے جائیں اور کارواں بنتا چلتا جائے یہاں تک کہ نئے نظریے کے مطابق معاشرہ اور ریاست وجود میں آجائے۔ اس کا بہترین ماڈل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کی جدوجہد ہے۔ یہ سفر راستے میں بچھے کانٹوں، پیٹھ پر اونٹ کی اوجھڑی، بیٹیوں کو طلاق، طائف کی گلیوں میں پتھر اور قتل کی سازش پر مشتمل ہوتا ہے اور شعب ابی طالب، ہجرت حبشہ، تپتی ریت میں سینے پر پتھر اور احد احد کی صداؤں سے لبریز ہوتا ہے۔ اس راستے میں بدر بھی آتا ہے، احد بھی اور بھوک کے مارے احزاب میں پیٹ پر پتھر بھی باندھنے پڑتے ہیں۔ مہاجرین نے جب مکہ چھوڑا تو مکان چھوڑنے پڑے، زمینیں چھوڑنی پڑیں، کاروبار تباہ ہوگئے اور ملازمتیں جاتی رہیں۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ ٹاٹ کی طرح کا کپڑا لپیٹے ہوئے آرہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فرمایا کہ یہ جوانِ رعنا (خوش شکل، خوش لباس، خوشحال، خوشبو لگائے) مکہ کی جس گلی سے گزر جاتا تھا وہ معطر ہوجاتی تھی اور اب اس کی یہ حالت ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کی یہ حالت تھی کہ کئی کئی دن چولہا نہ جلتا تھا۔ تو جناب! اسلامی انقلاب کے لیے یہ سب تو کرنا پڑتا ہے۔

پھر ایک وقت آتا ہے کہ اللہ کی نصرت، رحمت کی بارش کی طرح آتی ہے اور ریاست مدینہ وجود میں آجاتی ہے، مکہ فتح ہوجاتا ہے۔ نئی 'روحِ عصر' وجود میں آتی ہے اور ZZ.pY fiZi ç
الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا کا ترانہ ہر سُو گونجنے لگتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس ساری جدوجہد کی بنیاد کفر کی 'روحِ عصر' سے مقاومت و مزاحمت

پر ہے۔ جس دن آپ نے کفر پر مبنی 'روحِ عصر' سمجھوتے کی بات کی، آپ کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی اور آپ ثریا سے زمین پر آ رہیں گے۔ دورِ نبوی میں 'روحِ عصر' کی ترغیبات کچھ کم تو نہ تھیں۔ ''اے ابو طالب! ہم تمہارے بھتیجے کو بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اسے زر و جواہر سے تول دیں گے، خوبصورت ترین عورت اسے پیش کر دیں گے'' (گویا شیطان زر، زن اور زمین کے تینوں حربے لے کر آ گیا) اور اس کے بدلے میں مطالبہ صرف ایک کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہماری 'روحِ عصر' کی مخالفت ترک کر دے۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر اس وقت سمجھوتہ کر لیتے کہ انہیں وہ سب کچھ مل رہا تھا جس کی انسان اس زندگی میں تمنا کر سکتا ہے تو یہ ممکن تھا.... لیکن پھر اسلام ختم ہو جاتا اور آج کوئی اسلام کا نام لیوا نہ ہوتا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھوتہ نہ کیا بلکہ جو جواب دیا وہ تاریخ نے سنہری حروف میں محفوظ رکھا ہے۔ فرمایا ''اے چچا جان! اگر یہ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لا کے رکھ دیں تو بھی اپنی بات سے باز نہیں آؤں گا'' (اور ان کی 'روحِ عصر' کی مخالفت ترک نہ کروں گا)۔

اسی لیے ہم مغرب کے نظام تعلیم، اس کی جمہوریت اور نظام سرمایہ داری و بنکنگ سے مفاہمت کو رد کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مغرب کی الحادی جمہوریت کو کچھ اسلامی اصولوں کی دھونی دے کر اسلامی جمہوریت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا، نہ مغرب کے سرمایہ دارانہ اور سودی بنکنگ کے نظام میں کچھ درخ اندوزی کر کے اسے اسلامی بنایا جا سکتا ہے اور نہ مغرب کے تعلیمی نظام میں اسلامیات کے ایک مریل سے مضمون کا اضافہ کر کے اسے اسلامی نظام تعلیم قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ کو مغرب کی الحادی 'روحِ عصر' سے بغاوت کرنا ہو گی، اس کی مزاحمت کرنا ہو گی، اسے ترک کرنا ہو گا، اپنا جھنڈا لے کر کھڑا ہونا ہو گا اور اس کے لیے ہاتھ کٹوانا ہوں گے۔ اور اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو اسلام زندہ باد کے نعرے لگانا چھوڑ دیں، غلبۂ اسلام، اسلامی نظام، اسلامی انقلاب، نظامِ مصطفیٰ کے نعرے ترک کر دیں۔ سیدھے سبھاؤ مغرب کی 'روحِ عصر' اس کی فکر و تہذیب اور سیکولرزم قبول کیجیے، نمازیں پڑھیے، روزے رکھیے، حج و عمرہ کیجیے اور مغرب کا تعلیمی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام، قانونی نظام، ثقافتی نظام قبول کر لیجیے اور چین کی بانسری بجائیے۔ جاوید غامدی صاحب آپ کو یہی تو سمجھاتے ہیں، سمجھ جائیے۔ مغربی فکر و تہذیب قبول کر لیجیے، اس کی مزاحمت ترک کر دیجیے اور افیون کھا کر لمبی نیند سو جائیے۔

تعلیم و تربیت

سید خالد جامعی

جدید تعلیمی ادارے اسلامی اقدار کو تبدیل اور تباہ کر رہے ہیں (آخری قسط)

ملک کی دو اہم یونیورسٹیوں (جامعہ کراچی اور جامعہ پنجاب) کا چشم کشا مطالعہ

ڈاکٹر عارفہ فرید کی اصل عبارت خط نستعلیق میں ہے اور قوسین میں ہم نے خط نسخ میں اپنا تبصرہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

محترمہ ڈاکٹر عارفہ فرید اور ۱۹۵۰ء کی کراچی یونیورسٹی

ہندوستان کے مسلمان اپنے ساتھ جو کلچر لائے تھے اور جو کلچر پاکستان کی سرزمین پر پہلے سے قائم تھا جب ان دونوں کے اختلاط کے بعد ان پر وقت کی باگ چھٹی تو روایتوں کی اتنی تیزی سے شکست و ریخت ہوئی کہ کسی بھی رویہ یا طرز عمل کو پکڑ کر یہ کہنا مشکل ہوگیا کہ یہ پاکستانی کلچر کی روایت ہے۔ (غور کیجیے دین کی جگہ کلچر کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ جدیدیت کا یہی طریقہ ہے عارفہ فرید صاحبہ فلسفی ہیں لہذا دین کی روایات کو عقیدے سے نکال کر ہندوستانی مقامی ثقافت سے دانستہ جوڑ دیا گیا تاکہ بتایا جائے کہ کلچر تو بدلتا رہتا ہے جب کہ دین کبھی نہیں بدلتا۔ اسی طرح روایت بھی بدل سکتی ہے اگر وہ مذہب سے وابستہ نہ ہو۔ مذہبی روایت کبھی نہیں بدلتی جیسے مسواک کرنا، سلام کرنا، بڑوں کا ادب، بزرگوں کی تعظیم، عورتوں کا احترام ان کو اپنی ماں بیٹی کی طرح سمجھنا، افطار میں کھجور کھانا، مہمان کو اللّٰہ کی رحمت سمجھنا وغیرہ وغیرہ)

جامعہ کراچی میں بھی یہی کچھ ہوا۔ علی گڑھ کے پروفیسر خواتین کی علیحدہ یونیورسٹی کے آرزومند تھے۔ مخلوط تعلیم اور لڑکے لڑکیوں کا آپس میں بات کرنا ان کو سخت ناپسند تھا۔ (یعنی یہ چند اساتذہ کا ذاتی مسئلہ تھا مذہبی، تہذیبی، اخلاقی، اسلامی، ایمانی، دینی اور قومی، ریاستی، ادارتی، حکومتی مسئلہ نہیں تھا)۔

ادھر طلباء اور طالبات کا یہ عالم کہ آپس میں جھجھک اور لحاظ کے مارے شاذ و نادر ہی کبھی کوئی بات چیت ہوتی۔ لڑکوں کا تو کہہ نہیں سکتی، لڑکیاں اپنے ہم جماعت لڑکوں کے نام تک

سے ناواقف رہتی تھیں۔لڑکیاں گروپ بنا کر چلتی تھیں۔کیمپس پر کوئی اکیلی لڑکی چلتی نظر نہ آتی۔لڑکے لڑکیوں کے نام سے پہلے ''مس'' لگا کر پکارتے تھے۔لڑکیاں لڑکوں کے نام کے ساتھ ''بھائی'' لگاتی تھیں۔(آج کل کی لڑکی لڑکے کو بھائی کیوں نہیں کہتی؟ یہ اصل نکتہ ہے۔محترمہ ڈاکٹر عارفہ فرید نے اس پر توجہ نہیں دی)۔

پھر رفتہ رفتہ قربتیں بڑھیں اور فاصلے کم ہوئے۔آپس میں بات چیت کا رواج ہوا۔برقعے تقریباً ناپید ہو گئے یا کم ہو گئے۔لڑکیوں نے گاؤن کا سہارا لیا۔پھر آزادی کی طرف مزید قدم بڑھایا۔سر پر دوپٹے رہنے لگے۔پھر وہ بھی گلے میں پڑنے لگے۔[قربتیں بڑھنے کا نتیجہ برقع کا خاتمہ تھا۔ فاصلے کم ہوگئے تو فاصلے بڑھانے والے برقع پردہ حجاب شرم حیاء کی کیا ضرورت؟ وہ دوپٹے جو پہلے سر پر پڑتے تھے گلے میں آگئے اور آخر کار گلے پڑگئے اور اب اُتر ہی گئے]۔

اب لڑکے لڑکیاں برابری کے احساس کے ساتھ دوستانہ ماحول میں کلاسوں میں آتے جاتے ہیں۔وقت کا یہی تقاضا تھا۔وقت کا ساتھ نہ دیں تو انسان پیچھے رہ جاتا ہے اور زمانہ آگے نکل جاتا ہے۔لڑکیوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی (یعنی لڑکیوں کی شرم و حیاء کو محترمہ اعتماد کی کمی بتا رہی ہیں اسی لیے عصر حاضر میں بے شرم عورت کے لیے کہتے ہیں وہ بولڈ (Bold) عورت ہے۔ پہلے لڑکیاں لڑکوں کے برابر نہیں تھیں ان میں تفاوت تھا جب آپس میں میل جول بڑھا برقعے اُتر گئے تب برابری کا احساس پیدا ہوا او دوستانہ ماحول نے جنم لیا اس سے پہلے ایک دوسرے سے بُعد تھا اس لیے آپس میں میل جول نہ تھا دوست ہی آپس مین ملتے ہیں)۔لڑکوں کی چھیڑ چھاڑ کی عادت ختم ہوئی (آزادانہ اختلاط کے بعد چھیڑ چھاڑ کی کیا ضرورت؟ ہر طرح کی جب آزادی مل گئی تو مسئلہ خود حل ہوگیا)۔خیالات کا تبادلہ ہوا۔دونوں جنسوں کو پتہ چلا کہ ان کا تعلق ایک ہی نوع سے ہے۔مفاہمت بڑھی۔ایک دوسرے پر اعتماد بڑھا۔ترقی کی راہیں کھلیں۔(مغرب بھی یہی بتاتا ہے کہ عورت مرد کی دوستی سے ہی ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔ پہلی مرتبہ مرد کو معلوم ہوا کہ عورت بھی ہم جنس ہے، انسان ہے، آدم کی اولاد ہے یونیورسٹی کی مخلوط تعلیم سے پہلے یہ بات نہ لڑکے کو معلوم تھی نہ لڑکی کو) فرسودگی نے پیچھا چھوڑا۔لیکن اس کا مطلب یہ

نہیں کہ پہلے جو تھا وہ غلط تھا۔ وہ اس وقت کا تقاضا تھا یہ اِس وقت کی پکار ہے۔ (اسے کہتے ہیں ھیگل کا تصور تاریخ ــ جدلیاتی تاریخ ــ ہر زمانے کا اپنا سچ ہوتا ہے۔ سچ آفاقی، حقیقی، قطعی نہیں ہوتا زمانہ بدلنے سے سچ بدل جاتا ہے ہر اگلا زمانہ پچھلے سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے Thesis, Anti Thesis اور Synthesis یہی ہے۔ پردہ، حجاب، شرم، حیاء سب فرسودہ اقدار تھیں) پہلے یہ غلط تھا اب وہ غلط ہے۔ روایتیں معاشرہ کی بھلائی کے لیے ہوتی ہیں ان کو بت بنا کر پوجا نہیں جا سکتا۔ اگر ان کی افادیت ختم ہو جائے تو وہ خود بخود دوسری روایتوں سے بدل جاتی ہیں (یعنی عورت مرد کی دوستی روایت ہے۔ پہلے عورت مرد میں فاصلہ روایت تھا اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ روایت اور ثقافت تو بدلتی رہتی ہے۔ کل عورت کپڑے اُتار دے تو یہ روایت بھی معاشرے کی بھلائی میں شمار ہوگی۔ یہ وقت کا تقاضا ہے اور وقت بدلتا رہتا ہے) البتہ سچائی انسانیت اور محبت چند ایسی آفاقی اور مطلق روایتیں ہیں جن کا کوئی نعم البدل نہیں [پروفیسر ڈاکٹر عارفہ فرید، پاکستانی کلچر کی روایات، کراچی، رائل بک کمپنی ۱۹۹۳ء، ص ۱۲۳۔ ۱۳۳]

اس عبارت کو پڑھنے کے بعد سوچیے کہ علی گڑھ اور سرسید کے خلاف اس وقت کے جید علماء نے جو متفقہ مشترکہ فتوے دیے کیا وہ غلط تھے؟ وہ بڑے لوگ تھے، وہ اکابر تھے ان کی رائے بغیر کسی شک وشبہ کے درست تھی۔ تاریخ، حالات، واقعات اور تجربات نے ان کی رائے کی سو فی صد تصدیق کر دی ہے۔ مغرب میں اس کا جزوی ردعمل Dad School، Mom School کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔ عہد حاضر کے اصاغر کی رائے جدیدیت اور جدید تعلیم کے بارے میں معتبر نہیں ہے۔ حقیقت میں وہ بڑے تھے اور ہمیں تو بس بڑوں کی موت نے بڑا بنا دیا ہے۔

عارفہ فرید خود فلسفی ہیں مگر وہ اس بات کے ادراک سے قاصر ہیں کہ جب ایک عورت مرد جیسی ہو جائے اور مرد جیسے کام کرے تو عورتوں کے کام کون کرے گا؟ اللہ نے جو اعضاء عورت کو دیے ہیں وہ مرد کو نہیں دیے۔ مغرب نے آزادی، تعلیم، نوکری کے ذریعے خاندانی نظام کو تباہ کر دیا۔ اس صدی کا لبرل ازم کا سب سے بڑا فلسفی جان رالس لکھتا ہے کہ عورت کو مرد جیسا بنا دو وہ بچے پیدا نہیں کرے گی۔ بچے روکنے کے لئے قانون کی ضرورت نہیں۔

China has imposed harsh restrictions on the size of families & has adopted other draconian measures but there is no need to be so harsh. Instructive here is the Indian state of Kerala, which in the late 1970s empowered women to vote & to participate in politics to receieve & use education & to own & manage wealth & property. As a result, within several years Kerala's birth rate fell below china's without invoking the coercive power of the state. China's birth rate in 1979 was 2.8 Kerala's 3.0. In 1991 these rates were 2.0 & 1.8 respectively. [John Rawls., The Law of People with the Idea of Public Reason Revisited, Harvard University Press, USA. 2003, p. 110]

پہلے اپنے ایمان وعقیدے کی اصلاح کیجیے، پھر متبادل کا سوال اٹھائیے

ہم آپ کو جدید تعلیم کا متبادل بھی بتادیں گے لیکن پہلے جدیدیت کا انکار کیجیے

سوال یہ ہے کہ پھر تعلیم و تعلم کا سلسلہ کیسے ہو؟ اسکول کی تعلیم کے بغیر آپ جاہل رہ جائیں گے۔ جہالت خود ظلم ہے۔ اگر جدید تعلیم نہ ہوتو اس کا متبادل کیا ہے؟ جدید فنون کے بغیر دنیا کیسے چلے گی؟ ہم پیچھے رہ جائیں گے وہ آگے نکل گئے ہیں۔ ترقی کیسے ہوگی؟ بنیادی مسئلہ ترقی ہے اور اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان کے قریب کیسے پہنچ جائیں کیوں کہ ہم تو بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ قرآن نے جہالت کی کیا تعریف کی ہے اور جاہلیت کسے کہا ہے؟ عاد، ثمود، فراعنہ، ترقی، سائنس، ٹیکنالوجی میں انبیاء سے بہت آگے تھے۔ قرآن نے اس تمدن کو جاہلیت خالصہ کیوں کہا ضلالت کیوں قرار دیا؟ اس سے بھی زیادہ اہم ترین سوال یہ ہے کہ دنیا میں ترقی کا کوئی ماڈل سود اور قرضے کے بغیر ہے یا نہیں؟ کیا روایتی الہامی تہذیبوں میں ترقی قدر تھی یا نہیں؟ کیا کسی دین اور مذہب میں ترقی عقیدہ ہے یا نہیں؟ کیا ترقی بغیر سود قرضے بھیک امداد خیرات کے ممکن ہے یا نہیں؟ کیا ترقی کا کوئی ایسا ماڈل موجود ہے جس نے ماحولیاتی آلودگی پھیلا کر دنیا کو تباہ و برباد نہ کیا ہو اور اربوں مخلوقات کو قتل نہ کیا ہو؟

یہ اہم سوالات ہیں مگر ان سوالات کے سلسلے میں دنیا کی تہذیبوں میں علم کی تعریف، تعلیم کی تاریخ، معاش کے حصول کی تاریخ اور علم کی تاریخ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ علم، فنون (Art) (Craft) کاری گری میں کیا فرق ہے، وہ جاننا ضروری ہے۔ صدیوں تک سائنس پہلے فلسفے کی

شاخ کیوں تھی انیسویں صدی میں اچانک سائنس فلسفے سے الگ کیسے ہوئی اور بیسویں صدی میں سائنس خود کیوں فلسفہ بن گئی؟ فلسفۂ سائنس (Philosophy of Science) ایک نیا فلسفہ ہے یہ پہلے کیوں نہیں تھا؟ سائنس فلسفے سے الگ کیوں کی گئی۔ سترھویں صدی تک سب سے بڑا فلسفی وہ تھا جو مابعد الطبیعیاتی سوالات کا جواب دیتا تھا، سائنس دانوں کو نیچرل فلاسفر کہا جاتا تھا، تجربی علم کو یونان میں اور روایتی تہذیبوں میں علوم کی تلچھٹ شمار کیا جاتا تھا۔ یونان میں سوفسطائیہ کو فلسفیوں نے گالی بنا دیا جو علم بیچتے تھے۔ کانٹ نے قبل تجربی اور بعد تجربی علم [عقلیت اور تجربیت کو ملا کر سائنس کو العلم کا درجہ دے کر میٹا فزکس کو احمقانہ کام قرار دیا۔ اس نے کہا کہ میٹا فزکس انسان کی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ہائیڈیگر نے Metaphysic of Presence کا تصور دیا۔ حاضر و موجود یعنی دنیا ہی سب کچھ ہے۔

علوم عالیہ، علوم آلیہ، علوم نقلیہ، علوم عقلیہ کی تقسیم کیا ہے؟ یہ سب اہم مباحث ہیں۔ ان کو جانے بغیر جدید تعلیمی نظام اور اس کے متبادل تعلیم کے طریقوں پر غور ممکن نہیں پہلے ایمان اور عقیدہ کی اصلاح کیجئے پھر یہ بتائیے کہ اللہ نے انسانوں اور جنوں کو کس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے؟ پھر متبادل کا سوال اٹھائیے اس کا جواب دے دیا جائے گا۔ ہم سے اچھے تو مغرب والے ہیں جنھوں نے اپنے نظام تعلیم کی اخلاقی، اقداری تباہی کے باعث اس کی معاشی، مادی، افادی اقدار کو مکمل اور محفوظ طریقے سے حاصل کرنے کے لیے Dad School اور Mom School کھلوائے۔ یہ جدید نظام تعلیم کا متبادل نظام نہیں ہے بلکہ جدید نظام تعلیم کی اخلاقی تباہ کاری اور بہت زیادہ قیمت [High Price] سے بچنے [یعنی نظام حاضر و موجود کی اصلاح کا ہی ایک اندرونی نظام ہے۔ یہ جدید تعلیم کو رد نہیں کرتا۔ اس کی اصلاح چاہتا ہے۔ اس طرح سے کہ اس کے بچے سستی اچھی تعلیم حاصل کریں اور ان کی اخلاقی زندگی اسکول میں خراب نہ ہو۔ بالغ ہونے کے بعد وہ جو چاہے کریں پہلے تعلیم و ترقی حاصل کرلیں۔ اسکولوں میں جا کر وہ پڑھتے نہیں ہیں آوارہ، زانی، غنڈے اور منشیات کے عادی بن جاتے ہیں۔

لداخ میں ۱۹۷۰ء تک روایتی معاشی تعلیمی نظام موجود تھا

۱۹۷۰ء تک لداخ میں روایتی طریقے سے معاشی، مذہبی، عقلی تعلیم کیسے دی جاتی تھی ایک کتاب پڑھیے۔

Helena Noberg : The Future of Progress: Reflections on Environment and Development.

اس کتاب کے اردو خلاصے کے لئے ہماری کتاب دیکھیے: ’’علماء کی تنخواہیں سب سے کم کیوں ہیں؟‘‘

دنیا کی کسی تہذیب وتاریخ میں ایک تعلیمی، معاشی، سیاسی، سائنسی نظام کیوں نہیں تھا؟

سرسید کا دعویٰ جھوٹا تھا کہ ہندوستانی جاہل غیر مہذب اور غریب ہیں

بنیادی سوال یہ ہے کہ دنیا کی کسی تاریخ وتہذیب میں ایک قومی زبان، ایک معاشی نظام، ایک تعلیمی نظام، ایک سائنسی نظام تھا؟ کیا کوئی تہذیب ایسی تھی جہاں روزگار میسر نہ تھا نہ رزق کے وسائل تھے؟ کیا دنیا کی ہر تہذیب میں ہر علاقے کی مقامی تعلیم، معاش، سائنس، علاقے میں موجود میسر اسباب وسائل کے مطابق ہوتی تھی یا عالمگیر تعلیم، عالمگیر معاش وسائنس کا تصور موجود تھا؟ جب تک ہم ان مباحث کی گہرائی میں نہیں جائیں گے اس سوال میں الجھے رہیں گے کہ اگر اسکول نہ ہوتا، سرسید نہ ہوتے، علی گڑھ نہ ہوتا تو مسلمان کہاں جاتے؟ جاہل اور عامی ہی اس قسم کے سوالات اُٹھاتا ہے۔ ہندوستان میں پوسٹ کالونیل مفکرین نے اپنی تمام تر غلطیوں اور حماقتوں کے باوجود مسلم ہندوستان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ سرسید اور رام موہن رائے کا یہ دعویٰ جھوٹا تھا کہ ہندوستانی لوگ اور حکومت جاہل، غیر مہذب اور غریب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان وہاں کے لوگ اور حکومت اپنے عہد کی امیر ترین نہایت مہذب اور تعلیم یافتہ تہذیب تھی لیکن انگریزوں کے معیارات پر پورا نہیں اترتی تھی۔ سرسید نے انگریزوں اور مغرب کو معیار بنا کر پورے ہندوستان کو جاہل، گنوار، غریب قرار دیا۔ یہ سرسید کی جہالت، حماقت، ضلالت تھی جس کی حمایت آج بھی بہت سے مذہبی، غیر مذہبی لوگ کررہے ہیں۔ صرف ہندوستانی طب پر سیما علوی کی کتاب پڑھ لیجیے اور ہندوستان کی معیشت، تعلیم، امارت پر ششی تھرور کی کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ مسلمان پندرہ سو سال تک کیا کرتے رہے وہاں اسکول، کالج، یونیورسٹی کیوں نہیں تھی؟ کیا وہ اجہل تھے؟ یہ ہے اصل سوال۔ بقراط، سقراط، جالینوس، فیثاغورث، ارسطو، سقراط، افلاطون کس یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ سے نکلے تھے؟ امریکا کے ریاستی فلسفی رچرڈ رارٹی [Rorty] نے اپنے ایک خطبے Is Philosophy relevant to Applied Ethics? میں لکھا ہے کہ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں فلسفہ دم توڑ رہا ہے۔ یہاں ارسطو، افلاطون جیسے آزادانہ، منفرد، اوریجنل خیالات

رکھنے والے فلسفی وجود ہی نہیں رکھتے۔ جب سے فلسفے کا علم شعبہ فلسفہ میں گیا ہے فلسفی نظامِ حاضر و موجود کا کارندہ بن گیا ہے، وہ آزادانہ غور و تدبر کے قابل نہیں رہا۔

۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کی لڑکیاں کتنی مذہبی تھیں اور آج مذہبی لڑکی کا کیا حال ہے؟

ماڈرن ڈسکورس کے بارے میں آپ نے ڈاکٹر عارفہ فرید کے مشاہدات، نتائج پڑھ لیے اب اس کی روشنی میں ایف ای چوہدری کے انٹرویو کو پڑھیے جو ۱۹۵۰ء کے لاہور اور ۱۹۵۰ کی پنجاب یونیورسٹی کے بارے میں انکشاف کررہا ہے۔ جدید تعلیم نے رفتہ رفتہ آپ کی تاریخ، تہذیب، اقدار، روایات میں کیا دراڑیں ڈالیں؟: لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کے احوال پڑھیے اور اس کا عہد حاضر سے موازنہ کیجیے۔

س: چودھری صاحب! وہ واقعہ کیا تھا، عورتوں کی گیمز والا، جب ایک عورت نے کہا، یہ مرد نہیں فوٹو گرافر ہے۔

ج: یونیورسٹی خواتین گیمز میں مرد کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

س: اچھا!

ج: بالکل اجازت نہیں تھی۔ یونیورسٹی میں مسز بیگ انچارج تھیں پنجاب یونیورسٹی سپورٹس کی، وہاں یونیورسٹی سپورٹس ہورہی تھیں مختلف کالجوں کی۔ مسز بیگ میرے پاس آئیں: چودھری صاحب! لڑکیوں کی تصویر کھینچ دینا۔ پہلی دفعہ سپورٹس ہوئی تھی یونیورسٹی گراؤنڈ میں۔

س: لڑکیوں کی،

ج: ہاں، لڑکیوں کی۔ یونیورسٹی گراؤنڈ میں چاروں طرف انہوں نے قناتیں کھڑی کردیں تاکہ کسی کی ''جھاتی'' نہ پڑے۔ میں نے مسز بیگ سے کہا: برقعہ سسٹم ہے، لڑکیاں برقعہ پہنتی ہیں، وہ پسند نہیں کریں گی، ان کی مائیں بھی آئی ہوں گی، وہ مجھے دیکھ کر شور مچادیں گی، اس لیے میں نے نہیں جانا۔ اس وقت برقعہ سسٹم بڑا سخت ہوتا تھا۔

س: بہت۔ یہ کب کی بات ہے؟

ج: ۱۹۵۰ء کی بات ہے غالباً۔ مسز بیگ کہنے لگیں: آپ فکر نہ کریں میں خود دیکھ لوں گی۔ میں اس وقت پاکستان ٹائمز میں ملازم ہو چکا تھا۔ کیمرہ لٹکائے ڈرتے ڈرتے مَیں وہاں

پہنچا۔ گیٹ پر مسز بیگ نے لڑکیوں سے کہہ دیا تھا، چودھری صاحب آئیں گے انہیں آنے دینا۔ اندر جاتے ہی تھوڑی دور جا کے ایک تنبو سا لگا تھا، وہاں لاؤڈ اسپیکر والا بیٹھا تھا جو ایونٹ بتاتا تھا کہ یہ ہائی جمپ ہے اور یہ فلاں ہے۔ مجھے انہوں نے اس کے پاس بٹھا دیا۔ ساتھ مجھے ایونٹ چھپی ہوئی کاپی دے دی کہ جس ایونٹ کی تصویر کھینچنا چاہیں کھینچ لینا۔ میں نے کہا چنگا۔ باقی ایونٹ دور ہو رہے تھے ہائی جمپ، لانگ جمپ وغیرہ۔ عورتیں اس طرف بیٹھی تھیں بہت ساری۔ مَیں جب فوٹو کھینچنے کے لیے بیٹھا، لڑکیوں نے فٹافٹ برقعے پہننا شروع کر دیے۔ ایک کہتی ہے: ''ہا، نی وِچ مرد پھردا ای''۔ دوسری کہتی ہے، ''یہ مرد کہاں ہے یہ تو فوٹو گرافر ہے۔ میرا پسینہ چھوٹ گیا۔ جو لڑکی فسٹ آئی تھی مَیں نے اس کی تصویر کھینچی۔ میں نے اس سے پوچھا تیرے والدین کو تو اعتراض نہیں، یہ نہ ہو کہ وہ پاکستان ٹائمز پر ہی دھاوا بول دیں۔ اس نے کہا، ہم تو بڑا پردہ کرتے ہیں یہ نہ چھاپنا۔ وہ میں نے کینسل کر دی۔ میں ایسی تصویر بنانے سے پہلے لڑکیوں سے پوچھ لیا کرتا تھا۔ جو کہے ہم پردہ نہیں کرتے بیشک آپ چھاپ دینا، اس کی تصویر بنا لیتا تھا۔ ہنڈرڈ میٹر ایونٹ تھا۔ اس طرح کے کئی ایونٹ ہو گئے۔ پھر ان کا جو کالج فرسٹ آیا تھا اس کی مسز بیگ نے تصویر کھنچوائی۔ میں نے کہا، یہ تو میں نہیں چھاپوں گا۔ پتہ نہیں لڑکیاں پردے والی ہوں۔ کہنے لگیں۔: ''نہیں، یہ میرے ریکارڈ کے لیے چھاپ دیں۔ پھر ہم نے تین چار تصویریں چھاپیں۔ مسز بیگ کہنے لگیں: لڑکیاں بڑی خوش ہوئی ہیں کہ دیکھو جی ہماری فوٹو چھپی ہے۔ دوسروں کو بھی incentive (ترغیب) ہو گئی۔ ان کے والدین نے اجازت دے دی۔ ہیں! وہ پھر آہستہ آہستہ Clarification (وضاحت) ہوتی رہی کہ جی بیشک چھاپ دیں۔ وہاں فوٹو گرافر Allowed نہیں تھا سوائے میرے۔ پھر اردو کے اخبار شروع ہو گئے مشرق، مغربی پاکستان۔ کسی کو Allow نہیں کیا مسز بیگ نے سوائے میرے۔ یہاں تک کہ ایک موقع ایسا آیا، میری لڑکی اس وقت کنیئرڈ کالج میں پڑھتی تھی۔

س: سٹائلا۔

ج: لڑکیوں نے اٹھا کر مجھے گرینڈ سٹینڈ پر کھڑا کر دیا کہ چودھری صاحب کی تصویر کھینچیں۔ انہوں نے ہمارے لیے بڑا کام کیا ہے۔ میں اُٹھ بیٹھا کہ چھوڑیں، کس طرف چل پڑی ہو۔ پھر یہاں تک ہو گیا: ''چودھری صاحب! میری تصویر کھینچیں میں سیکنڈ آئی ہوں۔ میں فسٹ آئی ہوں فلاں ایونٹ میں''۔ پھر ہمارا ''لیل و نہار'' شروع ہو گیا۔ سبطِ حسن اس کا

ایڈیٹر ہوتا تھا۔ ٹائٹل پیج کلر ہوتا تھا۔ اس وقت تھری کلر بلاک بنتا تھا۔

س: ''لیل ونہار'' اپنے وقت کا معیاری ہفت روزہ تھا۔

ج: تھری کلر بلاک کا بنتا تھا۔ کوڈک نے نئی فلم نکالی تھی، ٹرانسپرنسی۔ ایک (کمپنی) کا نام کوڈک تھا دوسری کا نام تھا اگفا۔ اگفا تھی یا کوڈک، یاد نہیں، اس کے ساتھ چار فلموں کی کٹ دیتے تھے کہ خود ہی ڈویلپ کریں۔ انسٹرکشنز کے مطابق ہم نے ڈویلپ کی۔ میں نے سبط حسن کو دکھائیں دو چار تصویریں کہ یہ آپ کے ہاں چھپ جائیں گی؟ اس کے لیے مَیں بناتا رہا، 'لیل ونہار' کے لیے۔

س: آپ نے بتایا وہ برقعے کا زمانہ تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوا آپ نے کسی لڑکی کی تصویر شائع کی اور اس پر ہنگامہ ہوا؟

ج: میں کنیئرڈ کالج کی طرف سے گزر رہا تھا جیل روڈ پر۔ وہاں بڑے خوبصورت پھول تھے، Blossom (کھلے ہوئے پھول) بڑے اچھے، میں نے کہا، ٹائٹل پیج کے لیے تصویر بناتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکی آ گئی ''چودھری صاحب! میری بھی تصویر کھینچیں''۔ میں نے کہا: ''آپ کے Parents (والدین) Objection (اعتراض) نہیں کریں گے؟''۔ ''نہیں نہیں۔ وہ نہیں کرتے بالکل''۔ وہ غالباً گوجرانوالہ کی تھی۔ میں نے کہا Blossom کو یوں دیکھ کے ہاتھ لگا۔ وہ میں نے تصویر کھینچی۔ سبط حسن کو دی۔ اس نے فرنٹ پیج پر چھاپ دی۔ چھاپ دی تو ٹیلیفون آیا اس لڑکی کے باپ کا: ہماری لڑکی کی تو منگنی ہوئی تھی۔ آپ نے بڑی غلطی کی جو اس کی تصویر چھاپ دی۔ آپ کے فوٹوگرافر کو چاہیے نہیں تھا کہ اس کی تصویر چھاپتا۔ ویسے ہمارا پردہ تو نہیں ہے لیکن لڑکی کی منگنی ہوئی ہے، آبجیکشن نہ ہو جائے دوسری طرف سے۔ سبط حسن نے کہا میں نے تو in good faith (نیک نیتی سے) چھاپی ہے۔ ہمارا جو رسالہ ہے وہ گڑبڑ والا تو ہے نہیں۔ وہ تو ایک لٹریری رسالہ ہے۔ پھر وہ لڑکی آ گئی کہ میرے والد صاحب نے بڑا محسوس کیا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ آپ اپنے اوپر لے لیں۔ میں نے کہا، فکر نہ کریں۔ میں اپنے اوپر لے لیتا ہوں۔ پھر میں نے سبط حسن سے کہہ دیا کہ انہیں کہنا، ہمارے فوٹوگرافر کو پتہ ہی نہیں تھا کہ اس لڑکی کی فوٹو کھینچ رہا ہے۔ وہ تو پھولوں کو دیکھ رہی تھی اس نے کلک کر دیا۔ اس طرح جان چھوٹی۔ یہ ایک دو Incident (واقعے) ایسے ہوئے تھے۔ ان واقعات کا لاہور سے تو کوئی تعلق نہیں۔

س: لاہور کے ساتھ ان کا بڑا تعلق ہے بڑا تعلق ہے کہ فوٹو گرافی اور پردے وغیرہ کے حوالے سے اس وقت کا لاہور کیسا تھا۔ چودھری صاحب! کبھی کوئی تصویر نہ بنانے کا افسوس بھی ہوا؟ [ایف ای چودھری سے منیر احمد کا انٹرویو 'اب وہ لاہور کہاں'' لاہور آتش فشاں پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء، ص۱۹۱ تا ۱۹۳]

۱۹۵۰ کی پنجاب یونیورسٹی اور شہرِ لاہور اور ۲۰۱۹ کا لاہور اور پنجاب یونیورسٹی، اسلامی تہذیب میں تبدیلی کا اعلان کر رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ میں پاکستان ٹائمز جیسا لبرل اخبار عورتوں کی تصویر کھینچتے، چھاپتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ آج ہر مذہبی لڑکی خود اپنی تصویر کھینچ رہی ہے، سیلفی وغیرہ یا شوق سے تصویر کھینچوا رہی ہے بلکہ اخبارات اور نیٹ پر شائع بھی کر رہی ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والی بعض باپردہ لڑکیاں، لڑکوں کے ساتھ کھڑے ہو کر بے شرمی سے تصویریں کھنچواتی ہیں اور لڑکوں کے بالکل پہلو میں کھڑی ہوتی ہیں۔ سب ایک ہی گلاس اور بوتل سے پانی پی لیتے ہیں۔ وہ ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے ایک ساتھ تفریحی پارکوں کا بھی سفر کرآتے ہیں جبکہ اسلام تو محرم کے بغیر حج وعمرہ پر بھی پابندی عائد کرتا ہے۔ یہ صورت حال صرف سائنس اور سوشل سائنس کے شعبوں میں نہیں اسلامیات کے شعبے میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسلامیات کی تعلیم اسلامی تہذیب، اصول، ثقافت، آداب اقدار کے بغیر دی جائے تو اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اسی لیے آج لڑکیاں سچ کہتی ہیں کہ اسلام ترقی کی راہ میں کہاں رکاوٹ ہے؟ یہ سب جدید تعلیم کا اثر ہے۔ سرسید نے کہا تھا وہ اپنے علم کلام سے جدید تعلیم کے خراب اثرات ختم کر دیں گے۔ ہم بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کی اعلیٰ اسلامی تربیت سے جدید تعلیم کے خراب اثرات ختم کر دیں گے۔ ہم حجاب میں سب کچھ کر لیتے ہیں۔ اسلام میں حجاب کا مطلب تبدیل ہو رہا ہے۔ ایک نئی تشریح وتفسیر جنم لے رہی ہے۔ اسلام کی نئی تعبیر کے ذریعے اسلام ہی کو منہدم کیا جا رہا ہے۔ ان بچیوں کو یہ تک معلوم نہیں کہ حجاب، نقاب، پردہ ان کے لیے ہے جو گھروں میں رہتی ہیں اور کبھی کبھی کسی عذر شرعی کی وجہ سے باہر نکلتی ہیں۔ وہ لڑکی جو صبح سے شام تک لڑکوں میں برقع پہن کر بیٹھی ہو، ان سے آزادانہ اختلاط کرتی ہو، خوش گپیاں کرتی ہو، ان کے ساتھ گھومتی، پھرتی، ہنسی، مذاق کرتی ہو اور یہ سمجھے کہ وہ حجاب کے احکامات پر عمل کر رہی ہے وہ اندھیرے میں ہے، کاش اسے روشنی حاصل ہو۔ اس وقت تو حال یہ ہے کہ بعض جدیدیت پسند علماء تک بڑے شوق سے، چاؤ سے دین کے فروغ، توسیع اور غلبے کے لیے اپنی تصویریں چھپوا

رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسکے بغیر گزارا نہیں۔ یہاں ایک سوال فوراً ذہن میں اٹھے گا کہ اگر لڑکیوں کو تعلیم نہ دی جائے تو کیا جاہل رکھا جائے؟ اسی سوال کی آڑ میں جدید سیکولر تعلیم کا اسلامی جواز مہیا کیا جاتا ہے۔ یہ ایک اہم موضوع ہے جس پر ہم آئندہ کبھی تفصیل سے لکھیں گے۔

ہمارے خیال میں چودھری صاحب کی گفتگو پڑھ کر ڈسکورس کا فلسفہ سمجھ میں آ گیا ہوگا! رہ گیا تعلیم کا مسئلہ تو عصری تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ یہ ہے اصل سوال۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمارا ایک مضمون ''علماء کے معاوضے سب سے کم کیوں ہیں؟'' پڑھ لیجیے اور جدید تعلیم پر ہمارا مضمون ''اسلامی اسکولوں میں ہم بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں؟'' پڑھ لیجیے اس کے بعد ہم بتائیں گے کہ جدید تعلیم کیا ہے؟ اس تعلیم کو صرف ڈیڑھ سو سال ہوئے ہیں اس سے پہلے تو یہ تعلیم نہیں تھی تو لوگ کیا پڑھتے تھے؟ کہاں پڑھتے تھے؟ کیا پڑھتے تھے؟ اس وقت تک غور و فکر کرتے رہیے۔

وہ لوگ جو متبادل میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں اور بار بار متبادل کا سوال اٹھاتے ہیں وہ ایک کتاب پڑھ لیں The War Within اسرائیل میں حقیقی مذہبی گروہ جدیدیت کا مقابلہ کیسے کر رہے ہیں ان کا موقف کیا ہے؟ مصنف لکھتا ہے۔

The girls of the Beit Ya'akov school system are thus qualified to sit for the state high school matriculation examination but are prevented by their rabbis from doing so. "Our girls know more so why should we agree to an inferior test?

Protests by the haredi camp came swiftly. We don't want our girls to study for the sake of studying claimed one of rabbis. We want our girls to accumulate knowledge for the sake of the community.

Study for the sake of knowledge only is a waste of time . What matters most to the haredi rabbis is their followers continued submission to their authority. Keeping them out of the mainstream of Israeli life cultivates a sense of dependence that solidifies control by religious leaders and their political representatives.[P 106]

مغرب اور جدیدیت کا علاج اکبر کی شاعری ہے

ہند میں سرسید کی متعارف کردہ جدید مغربی تعلیم کے اثرات کا سب سے بہترین، عمدہ، ناقدانہ جائزہ اکبرالہ آبادی نے لیا۔ اکبر کا ایک ایک شعر اس جدید تعلیم سے پیدا ہونے والے فتنہ وفساد کی پیشگی اطلاع تھا مگر اکبر کو ایک مسخرے، پھکڑ باز، احمق، ہنسانے والے، دل لگی کرنے والے شاعر کے طور پر لیا گیا حالاں کہ اکبر ایک عبقری تھے جو مغرب کا سفر کیے بغیر مغرب کا فلسفہ پڑھے بغیر مغرب کو اپنی نظروں کے سامنے مکمل بے حجاب دیکھ رہے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ علماء نے سرسید کا کفر حالی کی مسدس کے ذریعے پڑھ لیا اور مسدس حالی کو اسلام کی دردمندی کا شاہکار سمجھا، کیوں کہ شروع میں حالی کے نعتیہ اشعار غضب کے ہیں مگر تشبیب سے گریز تک آتے آتے حالی سرسید کے کفریہ افکار ایسی زبردست ملمع سازی اور اسلام کاری سے پیش کرتے ہیں کہ کسی کو محسوس تک نہیں ہوتا کہ سرسید کا کفر اسلامی لہجے میں کیسے منتقل کیا جارہا ہے مثلاً صرف ایک مصرعہ پڑھ لیجیے۔

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

کیا مسلمان، اسلام، امت، دینی علمیت مرغ بادنما ہے؟ اس مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے مسدس کا پیغام یہ ہے کہ اسلام یونان کے گم شدہ، مدفون، پھیلائے گئے علوم وفنون کو زندہ کرنے آیا تھا۔ مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم تھے وہ سبق انھوں نے پھیلا دیا۔ مغرب نے اندلس کے ذریعے یہ سبق ہم سے سیکھا اور ہمارے علوم عقلیہ میں اضافہ کر کے ہم پر غلبہ پالیا؟ یعنی مسلمانوں کے عروج کا سبب علوم عقلیہ میں عروج تھا اور زوال کا سبب علوم عقلیہ میں زوال تھا۔ اگر ترقی اور علوم عقلیہ ہی سب کچھ ہیں تو قرآن نے عاد، ثمود، قوم فرعون کی اتنی مذمت کیوں کی؟ وہ تو علوم عقلیہ میں انبیاء سے بہت آگے تھے۔ ان کی یادگاریں، شاہکار، عالمی ہنرمندی کے نمونے آج بھی محفوظ ہیں، انبیاء کا تو کوئی مادی شاہکار محفوظ نہیں۔ عجائبات عالم میں انبیاء کی کوئی تخلیق شامل نہیں۔

حیرت ہے کہ اس امت نے حالی کی قدر کی جو کسی قدر کے لائق نہیں تھے اور اکبر کو رد کردیا۔ اکبر وہ عظیم شاعر جس کی تعریف حکیم الامت اقبال نے کی۔ اقبال اپنے خطوط میں انھیں پیرومرشد لکھتے تھے۔ افسوس امت نے حالی کے ذریعے حالی کے پیرومرشد سرسید کو قبول کرلیا اقبال کے ذریعے اقبال کے پیرومرشد اکبر کی شاعری کو قبول نہ کیا!

تعلیم و تربیت　　مولانا عبدالمتین/ مدیر

ایک نئی اپروچ

دینی مدرسہ برائے تعلیمِ عوام

دینی مدارس کے علماء کرام توجہ فرمائیں

گرامی قدر ڈاکٹر صاحب

درس نظامی کے آخری سال 'البرہان' نظر سے گزرا تھا، تب سے اس کا قاری ہوں اور آپ کی آراء و افکار سے استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ فراغت کے بعد فکر معاش کے لیے جدوجہد جاری ہے، لکھنے کا ذوق بھی ہے اور دینی جرائد و اخبارات میں مضامین لکھتا رہتا ہوں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے دین پڑھنے کی توفیق دی اس لیے اسے آگے بڑھانے کا خیال بھی آیا۔ غور کرنے سے اندازہ ہوا کہ دینی مدارس تو متخصص علماء تیار کرتے ہیں۔ دینی سیاسی جماعتوں نے اپنا میدان الگ لگایا ہوا ہے، تبلیغی جماعت کا چھ نکات کی تبلیغ کا اپنا مخصوص ڈھب ہے۔ سوال یہ ہے کہ عامۃ المسلمین کی دینی تعلیم و تربیت کا ہمارے معاشرے میں کیا انتظام ہے؟ جب یہاں خلاء نظر آیا تو اس بارے میں سوچنا شروع کیا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر عامۃ المسلمین کے لیے روزانہ بعد مغرب (ماسوا اتوار کہ معاشرے میں چھٹی کا دن ہے) ڈیڑھ گھنٹہ تعلیم کا پروگرام بنایا جائے اور سے دو سال تک چلایا جائے اور اس دوران طلبہ کی دینی تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو شاید ایک عام مسلمان کے لیے مفید ہو کہ اسے ضروری دینی معلومات بھی مل جائیں اور ان پر عمل کی خواہش بھی اس کے اندر بیدار کر دی جائے۔

اب ذہن میں سوال یہ پیدا ہوا کہ اس پارٹ ٹائم دینی مدرسہ کا نصاب کیا ہو؟ میں نے اپنی حد تک غور و فکر کے بعد ایک نصاب تجویز کیا ہے جو لف ھذا ہے لیکن اس پر عمل سے پہلے مشاورت کا خیال آیا تو آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ اپنی ماہرانہ رائے سے نوازیں کہ جدید تعلیم اور دینی مدارس کے نصابات پر آپ کی گہری نظر ہے۔

والسلام،　　عبدالمتین، کراچی

مجوزہ دوسالہ نصاب برائے مدرسہ دارِارقم

	کتاب	دن	وقت	سال
۱	تعلیم العقائد	ہفتہ	بعد مغرب پہلا گھنٹہ	پہلی ششماہی
۲	قرآنی عربی سیکھیے آسان نحوصرف قصص النبیین	پیر، منگل، بدھ، جمعرات	بعد مغرب پہلا گھنٹہ	مکمل دو سال
۳	اُردو ادب وانشاء خوشخطی	ہفتہ	بعد مغرب پہلا گھنٹہ	مکمل دو سال
۴	سیرت و تاریخ	جمعہ	بعد مغرب پہلا گھنٹہ	مکمل دو سال
۵	جوامع الکلم، اربعین، معارف الحدیث	پیر، منگل، بدھ، جمعرات	بعد مغرب دوسرا گھنٹہ	مکمل دو سال
۶	الطریقۃ العصریہ، تکلم	پیر، منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ	بعد عشاء	مکمل دو سال
۷	ترجمہ و مختصر تفسیر قرآن	جمعہ	بعد مغرب و عشاء	دوسری ششماہی تا آخر
۸	تسہیل بہشتی زیور	جمعرات، جمعہ، ہفتہ	بعد مغرب دوسرا گھنٹہ	مکمل دو سال
۹	سلسلہ محاضرات	ہفتہ	بعد مغرب و عشاء	مکمل دو سال

وقت: بعد نمازِ مغرب تا بعد نمازِ عشاء۔کل ۹۰ منٹ یومیہ علاوہ اتوار

البرہان

مولانا عبدالمتین صاحب کے تیار کردہ نصاب پر گفتگو سے پہلے قارئین اور خصوصاً دینی مدارس چلانے والے علماء کرام سے چند باتیں:

۱۔ دینی مدارس چلانے والے علماء کرام اس مسئلے پر غور فرمائیں کہ جب طلب علم ان کے ہاں سے درس نظامی پڑھ کر فارغ ہوتا ہے تو اسے رزق کے لالے پڑ جاتے ہیں کہ وہ اپنی دال روٹی کیسے کمائے؟ ظاہر ہے مدارس کی تعداد، ماشاءاللہ، اتنی زیادہ ہے کہ فارغ ہونے والا ہر طالب علم نہ نئی مسجد بنا سکتا ہے اور نہ اسے مدرسہ میں نوکری مل سکتی ہے تو وہ کیا کرے؟ آپ جو آدمی تیار کرتے ہیں مسجد و مدرسہ کے علاوہ ان میں کوئی اہلیت آپ پیدا نہیں کرتے کہ وہ معاشرے میں کھپ سکیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے، مدارس چلانے والے علماء کرام اس پر غور کیوں نہیں کرتے اور اس کے حل کے لیے اقدامات کیوں نہیں کرتے؟

سوال یہ ہے کہ کیا یہ قرآن حکیم میں لکھا ہے کہ آپ نے مسجد و مدرسہ کے لیے آدمی تیار کرنے ہیں اور مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے آدمی تیار نہیں کرنے؟ اور معاشرے اور ریاست کو دنیا دار، مغرب پرست، سیکولر اور لبرل جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے کھلا چھوڑ دینا ہے کہ وہ انہیں غیر اسلامی انداز میں چلائیں؟ دینی مدارس میں بڑے بڑے دماغ بیٹھے ہیں۔ ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ ان کی کیا حکمت اور فراست ہے کہ وہ دینی تعلیم کو صرف مسجد اور مدرسہ کے لیے محدود رکھے ہوئے ہیں؟

آپ 'دینی' مدرسہ چلاتے ہیں، 'دین' کی تعلیم دیتے ہیں جس میں 'دنیا' کی تعلیم شامل نہیں ہوتی بلکہ 'دنیا' کی تعلیم کوئی اور دیتا ہے اور غیر دینی انداز میں دیتا ہے۔ 'دین' اور 'دنیا' کی یہ تفریق آپ کے ہاں کہاں سے آ گئی؟ سیکولر لوگوں کو چھوڑیے، آپ کے ہاں کہاں سے آ گئی؟ حقائق کیا ہیں؟ کیا بارہ سو سال تک امت کی تعلیم علماء کرام کے ہاتھ میں نہ تھی؟ کیا وہ تعلیم صرف 'دینی' تھی۔ یعنی آپ کے موجودہ تصور 'دین' کے مطابق صرف قرآن وسنت تک محدود تھی اور 'دنیا' کی تعلیم اس میں شامل نہ تھی؟ اگر ایسا تھا تو مسلمانوں نے بارہ سو سال تک دنیا پر حکومت کیسے کی؟ ان بارہ سو سالوں میں معاشرے اور ریاست کے لیے افراد کون تیار کرتا تھا؟

گستاخی معاف! یہ علماء کرام ہی کرتے تھے، یہ ان کے مدارس ہی کرتے تھے اور اس میں ’دین‘ اور ’دنیا‘ دونوں کے علوم پڑھائے جاتے تھے اور مدارس سے فارغ ہونے والے لوگ ہی مسلم معاشرہ اور ریاست چلاتے تھے۔ تو اب کیا ہوگیا ہے؟ اے علماء کرام! آپ نے اپنے اسلاف کا راستہ کیوں چھوڑ دیا ہے؟ خدارا سوچیے!

یہ بھی سوچیے کہ دینی مدارس میں جن بچوں کو پڑھا کر آپ مطمئن ہیں کہ آپ نے ’دین‘ کا حق ادا کر دیا، ان کی تعداد چند لاکھ ہے اور جو بچے آج جدید تعلیم کے اداروں میں پڑھ رہے ہیں، ان کی کی تعداد چار کروڑ ہے.... اور ان چار کروڑ سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں! کیا یہ بچے مسلمانوں کے نہیں؟ کیا ان کی اسلامی تعلیم و تربیت آپ کی ذمہ داری نہیں؟ آپ کل اللہ کے حضور کیا جواب دیں گے کہ آپ نے ان کروڑوں مسلمان بچوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کے لیے کیا کیا؟ بلکہ یہ کروڑوں مسلمان بچے آپ کے سامنے فاسد غیر اسلامی تعلیم حاصل کر رہے تھے لیکن آپ ٹس سے مس نہ ہوئے اور ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ نہ کیا؟

ہم علماء کرام کے اس عذر میں بھی وزن نہیں پاتے کہ ’دنیاوی‘ تعلیم دینا ریاست کا کام ہے اور اس پر بڑا خرچ اٹھتا ہے۔ جناب! ’دینی تعلیم دینا بھی مسلم ریاست کا کام ہے اور اس پر بھی کافی خرچ اٹھتا ہے۔ پھر آپ ’دینی‘ تعلیم کا اہتمام کیوں کرتے ہیں؟ اسے بھی ریاست پر کیوں نہیں چھوڑتے؟ اصل بات یہ ہے کہ آپ مسئلہ کو سمجھیں اور اپنا نظام تبدیل کریں، اپنی ترجیحات بدلیں، اسلاف کے راستے پر چلیں اور انگریز استعمار کے ردّ عمل میں بننے والی عارضی پالیسی کو ختم کریں۔

ہم اس جذباتی انداز کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن جب ہم بار بار کہنے کے باوجود اپنی بات کا اثر نہیں پاتے تو ’نوا را تلخ تر مے زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی‘ والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۔ دنیاوی علوم کی تدریس کا ہمالیہ جب تک سر نہیں ہوتا، اس وقت تک یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دینی مدارس اپنے طلبہ کو کسب رزق کے لیے کچھ ہنر اور فنون سکھا دیں جیسے فرج ٹی وی کی مرمت، کمپیوٹر اور موبائل کی مرمت، بجلی کا کام، موٹر سائیکل اور کار مرمت، طب اور ہومیوپیتھی، کمپوزنگ، ترجمہ، بی ایڈ و بی کام وغیرہ۔ ذہین طلبہ کو اعلیٰ تعلیم (ایم فل و پی ایچ ڈی) اور مقابلے

کے امتحانوں کی تیاری کرائی جائے....وغیرہ

۳۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ جس طرف مولانا عبدالمتین صاحب کا دھیان گیا ہے یعنی عامۃ المسلمین کی دینی تعلیم وتربیت، اس کی طرف ہمارے علماء کرام کا دھیان کیوں نہیں جاتا؟ وہ سو پچاس طلبہ کو دین سکھا کر مطمئن ہوجاتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ان کے اردگرد جو لاکھوں مسلمان زندگی گزار رہے ہیں ان کی دینی تعلیم وتربیت کیسے ہوگی؟ اور اس کا کون ذمہ دار ہے؟ اس سے پہلے ہم اپنی تحریروں میں یہ تجویز کرتے رہے ہیں کہ ہر دینی مدرسہ عصر اور عشاء کے بعد عامۃ الناس کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے کورس رکھے اور گرمیوں کی چھٹیوں میں سکول وکالج کے طلبہ کے لیے شارٹ کورسز کا اہتمام کرے۔ اب ہم مولانا عبدالمتین صاحب کی تجویز کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والا ہر عالم، جہاں بھی وہ رہائش رکھتا ہے، وہاں اس آبادی میں مغرب تا عشاء، عامۃ المسلمین کے لیے اپنے گھر کو یا اہل محلہ میں سے کسی کے ذرا وسیع ڈرائنگ روم کو یا محلے کی مسجد کو دینی مدارسہ بنالے اور عوام کی دینی تعلیم وتربیت کا کام شروع کردے تو لاکھوں گلی محلوں میں قال اللہ وقال الرسول کی صدا گونجنے لگے گی اور اس کے حیرت انگیز نتائج نکلیں گے۔ اس سے فرد کی اصلاح ہوگی، معاشرے کی اصلاح ہوگی اور وہ کام ہوگا جو اس وقت کہیں نہیں ہورہا۔ یہ ہے دعوت واصلاح اور اقامت دین کا بنیادی کام جس کی طرف دینی مدارس کو، علماء کرام کو اور دیگر دینی عناصر کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۴۔ اب آیئے مولانا عبدالمتین صاحب کے تیار کردہ مجوزہ نصاب کی طرف۔ اس کی اصلاح اور ترجیحات کی تبدیلی کے لیے ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

i۔ قرآن حکیم کی تعلیم سب سے اہم ہے لہٰذا قرآن حکیم لفظی ترجمہ اور تفہیم کے ساتھ روزانہ پڑھایا جائے اور یہ کام سادہ، آسان، موثر اور سائنٹفک انداز میں کیا جائے۔ اس کے لیے راقم نے 'تدریس القرآن' برائے اساتذہ وطلبہ تیار کی ہے جس کا پہلا یونٹ طبع ہو چکا ہے جس کا ایک نسخہ ان کو ارسال کردیا گیا ہے۔ اس طریقے سے ایک پارہ پڑھ لینے کے بعد طلبہ اس قابل ہوجائیں گے کہ باقی سارے قرآن کو سمجھنے لگیں (سوائے نئے الفاظ کے) ان شاء

اللہ۔

ii۔ حدیث میں میری رائے یہ ہے کہ 'ریاض الصالحین' پڑھائیں تاکہ وہ طلبہ کے تزکیۂ نفس کے لیے بھی مفید ہو۔

iii۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کوئی سادہ اور موثر کتاب ضرور پڑھائیں اور اس کے بعد سوانح خلفاء راشدین اختصار کے ساتھ۔

iv۔ فقہ کے صرف ضروری اور منتخب مسائل جن کی روزمرہ زندگی میں ایک مسلمان کو ضرورت پڑھتی ہے، پڑھائیں۔

v۔ جب طلباء کو دین کا عالم بنانا مقصود نہیں ہے تو انہیں عربی گرامر اور تکلم پڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ لفظی ترجمۂ قرآن پڑھاتے ہوئے گرامر کا کوئی قاعدہ ہلکے پھلکے انداز میں بتا دیا جائے اور قرآن ہی پر اُس کی تطبیق کروادی جائے، تو یہ کافی ہے۔

vi۔ مغربی فکر وتہذیب کے تنقیدی مطالعے اور ردّ کو محاضرات کا عنوان ضرور بنائیں بلکہ اس کے لیے بھی کوئی کتاب منتخب کرلیں۔ اس موضوع پر میری دو کتابوں ('اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش' اور 'اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ') سے بھی مدد حاصل کر سکتے ہیں۔

vii۔ اچھی اُردو پڑھنی لکھنی آجائے تو یہ کافی ہے۔

مولانا عبدالمتین صاحب! اُمید ہے یہ وضاحت کافی ہوگی۔ اس کے باوجود اگر کوئی تفصیل درکار ہو تو بلا جھجک ای میل کے ذریعے پوچھ لیں۔

والسلام،

محمد امین

تعلیم و تربیت　　پروفیسر طارق بٹ

دینی مدارس اور تجدد

دینی مدارس کی کمزوریاں اور ''تجدد اکیڈمی'' گوجرانوالہ کی سرگرمیاں

آپ نے البرہان شمارہ دسمبر ۲۰۱۸ء میں ''تجدد کی نرسریاں'' لکھ کر دینی مدارس کو توجہ دلانے کا حق ادا کر دیا کہ وہ اپنی صفوں میں تجدد کو پنپنے نہ دیں اور نہ خاموشی اور مداہنت سے کام لیں لیکن ہم ماہنامہ الشریعہ اور سوشل میڈیا پر شریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ کے اشتہارات دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہمارے علماء جتنے سست اور بے حس ہیں متجدد حضرات اتنے ہی چست اور فعال ہیں چنانچہ شریعہ اکیڈمی کے کرتا دھرتا عمار ناصر صاحب نے اپنی اکیڈمی میں 'تخصص فی الاصول' کے دوسالہ پروگرام کا اعلان کیا ہے جس میں اصول فقہ، اصول تفسیر، اصول حدیث، علم الکلام، فلسفہ ومنطق اور نحو و بلاغت کے اعلیٰ علمی مباحث کے تفصیلی مطالعہ اور تربیت کا اہتمام ہوگا۔ دوسرا پروگرام شعبان میں تین ہفتے کے دورۂ تفسیر قرآن ومحاضرات علوم قرآنی کا ہے جس میں دوسری چیزوں کے علاوہ تفسیر قرآن کے اصول وضوابط، علوم القرآن کے اہم مباحث اور مستشرقین اور ان کے افکار کا تعارف شامل ہے۔

ان پروگراموں کے روح رواں اور اصل کرتا دھرتا عمار خان ناصر ہیں جو ظاہر ہے غامدی صاحب کی فکر کے مطابق اور اس کی ترویج کے لیے یہ سارے مضامین پڑھائیں گے اگرچہ انہوں نے دونوں پروگراموں میں ایک دو چیزیں شیخ الحدیث وجانشینِ امام اہل سنت حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب مدظلہ کے لیے بھی رکھی ہیں اور انہیں نمایاں بھی کیا ہے تاکہ سند رہے۔

یاد رہے کہ پہلا پروگرام دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے ہے جن کو ماہانہ وظیفہ دینے اور ایک امریکی عیسائی مشنری یونیورسٹی کی فری یاترا اور اس میں تعلیم کا لالچ بھی دیا گیا ہے (جس میں عمار ناصر صاحب اپنے ہم نوا مستشرقین کے ساتھ مل کر دینی مدارس کے طلبہ کی برین واشنگ کرتے اور علم اور روشن خیالی کے نام پر انہیں متجدد بناتے ہیں) جبکہ دوسرے پروگرام میں دینی مدارس میں زیر تعلیم طلبہ بھی شریک ہوسکتے ہیں۔ اس طرح کے کورس جب غامدی صاحب نے المورد لاہور میں شروع کیے تھے تو معقول ماہانہ سکالر شپ ہونے کے

باوجود بہت کم طلبہ آئے اور جو آئے وہ بھی بھاگ گئے لیکن اب کے نام چونکہ 'شیخ الحدیث' اور 'جانشینِ امام اہل سنت' کا ہے لہٰذا طلبہ آئیں گے اور متجدد بن کر نکلیں گے۔ یوں شریعہ اکیڈمی ایک باقاعدہ تجدد اکیڈمی گوجرانوالہ کا روپ دھار گئی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ علماء کرام اپنے رویے پر غور فرمائیں، اپنے نظام ونصاب پر نظرثانی فرمائیں اور عصری افکار وعلوم کے تنقیدی مطالعے کو شامل نصاب کریں اور اپنے میں سے کالی بھیڑوں صفایا کریں۔ لیکن اگر انہوں نے اپنے نظام ونصاب کو بھی بہتر نہ بنایا اور متجددین کی سرگرمیوں پر روک لگانے کا بھی نہ سوچا تو پھر یہی ہوگا کہ طلبہ ان کے مدرسے میں پڑھیں گے اور تجدد کا تخصص مولانا زاہد الراشدی اور عمار ناصر صاحب کی تجدد اکیڈمی سے کریں گے۔ تو ان کے ہاتھ کیا آئے گا؟

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

حکومت پنجاب کی نئی پانچ سالہ تعلیمی پالیسی

مختصر تبصرہ

وزیر اعلیٰ پنجاب اور وزیر تعلیم پنجاب نے ۲۱ فروری ۲۰۱۹ء کو پنجاب کی پانچ سالہ (۲۰۱۸ء-۲۳) تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا ہے۔ تفصیلی پالیسی رپورٹ تو فوری طور پر دستیاب نہیں ہے لیکن مذکورہ وزراء کے بیانات سے جو بات واضح ہوئی ہے وہ سوائے ماضی پر سیاسی تنقید اور مستقبل کے متعلق سطحی وعدوں اور نعروں کے اور کچھ بھی سامنے نہیں آیا۔ کہا گیا کہ پچھلے سات عشروں میں تعلیم کے شعبے کو نظر انداز کیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ۲۸ ملین بچوں کا تعلیمی مستقبل داؤ پر ہے اور گورنمنٹ کے ۵۲ ہزار سکولوں میں داخل ۱۲ ملین بچوں کے ہم ذمہ دار ہیں۔ پرائمری سطح پر اُردو کو بطور ذریعۂ تعلیم اپنانے کا فیصلہ کیا گیا جب کہ انگریزی کو بطور مضمون پڑھانے کی اجازت دی گئی۔ مڈل کی سطح پر سائنس، انجینئرنگ، ٹیکنالوجی، آرٹ اور ریاضی پڑھانے کا اعلان کیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اب بچے فخر کے ساتھ ایک پاکستانی کی حیثیت سے تعلیم حاصل کریں گے جہاں نسل، رنگ وغیرہ کی کوئی تمیز نہیں ہوگی اور نہ ان کی بنیاد پر تفریق کی جائے گی۔ سکول اور کلاس رومز میں یکساں سہولتیں دی جائیں گی اور ان میں مخلص اساتذہ مقرر کیے جائیں گے۔ روجھان اور تونسہ شریف کے سکولوں میں وہی سہولتیں ہوں گی جو لاہور کے سکولوں میں دی جارہی ہیں۔ وہ بچے جو سکول نہیں جارہے انہیں بعد دوپہر کے انصاف سکول پروگرام کے ذریعے تعلیم مہیا کی جائے گی۔

جن نکات کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے اور جنہیں عزت مآب وزیر اعلیٰ نے چنیدہ نکات کے طور پر اپنی پالیسی تقریر میں بیان کیا ہے انہیں نرم سے نرم زبان میں لاعلمی، سطحی پن اور بے مقصد بیان بازی کا شاہکار ہی کہا جاسکتا ہے۔ ہم ان نکات پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے کہ ان کا بودا پن اور تعلیم کے اصل مسائل سے بے تعلق ہونا اظہر من الشمس ہے۔

اگر موجودہ حکومت تعلیم کے شعبے میں کوئی حقیقی انقلابی کام کرنا چاہتی تھی تو بتانا چاہیے تھا کہ:

۱۔ تعلیمی انتظام وانصرام میں کیا تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں؟ تعلیمی مزدوروں یعنی کلاس روم ٹیچر سے لے کر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن تک کو کس طرح باوقار، بااختیار اور باصلاحیت بنایا جا رہا ہے؟

۲۔ سول بیوروکریسی جو تعلیم کی راہ میں اصل رکاوٹ ہے، کو کس طرح تعلیم کے شعبے سے آؤٹ کیا جا رہا ہے؟ نیز سیاسی مداخلت کا قلع قمع کرنے کا کیا راستہ اختیار کیا جا رہا ہے؟

۳۔ تعلیم پر خرچ ہونے والے بجٹ کو، جو مجرمانہ حد تک کم ہے، کس حد تک بڑھایا جا رہا ہے تاکہ مطلوبہ تعلیمی سہولیات مہیا ہو سکیں؟

۴۔ یکساں نظامِ تعلیم، یکساں نصاب تعلیم اور یکساں نظام امتحانات کے لیے کیا اقدامات کیے جا رہے ہیں تاکہ پی ٹی آئی کے تعلیمی منشور پر عمل کی راہ ہموار ہو؟

۵۔ تعلیم کے گرے ہوئے اور گرتے ہوئے معیار کو بہتر بنانے کے لیے کیا اقدامات تجویز کیے جا رہے ہیں؟

بدقسمتی سے جن باتوں کا اعلان ہوا ہے ان سے تو جو کچھ پہلے سے موجود ہے اس سے بھی ہاتھ دھونے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تحریک انصاف کی حکومت میں کوئی وژنری لیڈرشپ ہے ہی نہیں۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

ہم اُردو کا حلیہ بگاڑنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟

عوام موبائل میں رومن اُردو لکھنا چھوڑ دیں اور اشتہاری ایجنسیاں اشتہارات میں

قیامِ پاکستان سے پہلے انگریزی کا تسلط اور اس کا حکومتی اور دفتری زبان ہونا اور ذریعۂ تعلیم ہونا سمجھ میں آتا تھا کہ اس وقت انگریزی استعمار کی حکومت تھی اور وہ اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی زبان کو اپنے سیاسی غلبے کا ذریعہ بنانے پر تلا ہوا تھا۔ لیکن ہماری عقلوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہم نے پاکستان بننے کے بعد بھی وہی غلامانہ روش برقرار رکھی اور اُردو کو قومی زبان تسلیم کرنے کے باوجود اور اس کے حق میں عدالتی فیصلے آنے کے باوجود آج بھی حکومتی، دفتری اور سرکاری زبان انگریزی ہی ہے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا ہے یا کم از کم پہلی جماعت بلکہ پری سکول سے ہی اسے لازمی مضمون کی شکل دے دی گئی ہے۔ ہمیں اس کا کوئی جواز اور حکمت اس کے سوا نظر نہیں آتی کہ ہم مغرب کے فکری غلام رہنے پر مصر ہیں ورنہ اگر صرف اچھی انگریزی سیکھنا مقصد ہو تو وہ ان دونوں علتوں (یعنی انگریزی ذریعۂ تعلیم اور پری سکول سے لازمی انگریزی) کے بغیر کالج، یونیورسٹی یا خصوصی اکیڈمیوں میں سیکھی جا سکتی ہے اور دنیا کے اکثر ممالک میں اسی طرح سیکھی سکھائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں شرمناک صورتِ حال یہ ہے کہ اس رویے کو حکومتی سرپرستی حاصل ہونے کی وجہ سے نہ صرف عامۃ الناس نے قبول کر لیا بلکہ دینی جماعتوں کے کارکنوں نے بھی قبول کر لیا اور آج ان کے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں انگریزی میڈیم اور لازمی انگریزی کے ذریعے مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔

جب ریاضی انگریزی میں پڑھائی جانے لگی تو اردو ہندسے غائب ہو گئے یا کر دیے گئے اور اب نئی نسل اردو ہندسے بالکل نہیں سمجھتی۔ جو بچے انگریزی میڈیم میں پڑھتے ہیں ان کو اردو نہیں آتی۔ اسی طرح جب سے موبائل آیا ہے اور لوگوں نے اسے مختصر پیغامات (SMS) بھیجنے کا ذریعہ بنایا ہے، اکثر لوگوں نے رومن اردو لکھنی شروع کر دی ہے یعنی وہ اردو، عربی رسم الخط کی بجائے انگریزی حروف میں لکھتے ہیں۔ اسی طرح اشتہاری ایجنسیوں نے بڑے بڑے بل بورڈز اور اخبارات و ٹی وی کے اشتہارات رومن اردو میں لکھنے شروع

کردیے ہیں۔ یہ رویہ غلط اور قابل مذمت ہے۔عوام کو چاہیے کہ وہ اردو لکھنے والا ایپ لوڈ کریں اور پیغامات عربی/ اُردو رسم الخط میں لکھا کریں نہ کہ رومن رسم الخط میں۔ اشتہاری ایجنسیوں کو بھی رومن رسم الخط ترک کردینا چاہیے۔

اس بات کی اہمیت کو نہ سمجھنا سادہ لوحی ہے۔ جو قومیں اور تہذیبیں اپنی زبان نہیں رکھتیں وہ مٹ جاتی ہیں۔ وہ جس قوم کی زبان بولتی ہیں، جس کا لباس اختیار کرتی ہیں اور جس کی طرح کا بننا چاہتی ہیں وہ جلد یا بدیر اس کی غلام بن جاتی ہیں اور اپنی آزادی کھو بیٹھتی ہیں لہٰذا ہمیں ایک زندہ اور غیور قوم کی طرح اپنی زبان کی حفاظت کرنی چاہیے۔آیئے عہد کریں کہ آج کے بعد کسی کو رومن اردو میں موبائل پیغام نہیں بھیجیں گے بلکہ اردو رسم الخط استعمال کریں گے اور انگریزی ذریعۂ تعلیم اور پری سکول سے لازمی انگریزی کی مزاحمت ومخالفت کریں گے۔ زندہ، آزاد اور غیور قوم ہونے کا تقاضا یہی ہے۔

اسلام اور پاکستان

ڈاکٹر محمد امین

آسیہ مسیح کیس۔ممتاز قادری کیس۔حرمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کیا پاکستان کا عدالتی نظام اسلامی ہے؟

ممتاز قادری کی پھانسی اور آسیہ مسیح کی رہائی کے عدالتی فیصلوں نے ہم جیسے ان مسلمانوں کے لیے جو پاکستان کا مستقبل اسلام میں دیکھتے ہیں، بعض انتہائی سنجیدہ سوالات کھڑے کر دیے ہیں مثلاً:

۱۔ کیا ہمارا عدالتی نظام اسلامی یعنی مطابقِ اسلام ہے؟

❁ کیا اس کے ’اسلامی‘ ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ نیچے سے لے کر اوپر تک جج ’مسلمان‘ ہوں؟ (جبکہ آئین کی رو سے تو ججوں کا مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں اور غیر مسلمان جج ہر سطح پر پہلے بھی رہے ہیں اور آج بھی ہیں) یعنی اتنا کافی ہے کہ ججوں کا نام مسلمانوں جیسا ہو اور وہ ’’قانوناً‘‘ مسلمان ہوں، لیکن ان کے لیے قرآن وسنت اور اسلامی قانون (فقہ واصولِ فقہ) میں مہارت اور متقی ہونا ضروری نہ ہو اور نہ ریاست اس امر کی مکلف ہو کہ وہ جج بننے والوں میں ان اہلیتوں اور مہارتوں کی شرط رکھے اور یہ خصوصیات ان میں پیدا کرنے کے لیے ان کی موزوں تعلیم وتربیت کا انتظام کرے۔

❁ کیا ججوں کے لیے آئینی اور قانونی طور پر ضروری ہے کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کریں؟

❁ یہ تصور اور فرض (Assume) کر لیا جاتا ہے کہ ہمارا آئین اسلامی ہے لیکن اگر کسی معاملے میں قرآن وسنت اور آئین موافق اور ہم آہنگ نہ ہوں تو جج قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کریں گے یا آئین کے مطابق؟ آئین میں یہ لکھا ہے کہ وہ آئین کے مطابق فیصلے کریں گے (چنانچہ ممتاز قادری کیس میں ابتدائی عدالت کے جج نے لکھا کہ ملزم نے شاتم رسول کو قتل کیا تو شرعی لحاظ سے کوئی جرم نہیں کیا لیکن مَیں آئین پاکستان کے تحت دہشت گردی کے قوانین کی خلاف ورزی کے جرم میں اسے سزائے موت دیتا ہوں۔اور اسی کیس میں سپریم کورٹ کے

ججوں نے ریمارکس دیے کہ کیوں نہ یہ کیس شریعت کورٹ کو بھجوا دیا جائے کہ ہم شریعہ کے ماہر ججز نہیں۔ لیکن چند دن بعد انہوں نے ''آئین اور قانون کے مطابق'' اس کیس کا فیصلہ کر دیا۔

۲۔ سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں ہم پر، ہماری ریاست پر، ہماری حکومت پر اور ہماری عدلیہ پر قرآن حکیم کے اس حکم کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ

۱۔ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ [المائدۃ ۵:۴۴] ۲۔ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ [المائدۃ ۵:۴۵]

۳۔ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ [المائدۃ ۵:۴۷]

یعنی جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام (یعنی قرآن وسنت) کے مطابق فیصلے نہ کریں ۱۔ وہ ظالم ہیں ۲۔ وہ فاسق ہیں ۳۔ وہ کافر ہیں۔

۳۔ مندرجہ بالا سوالوں کا تعلق سیاستدانوں اور حکمرانوں سے ہے جنہوں نے ملک میں مغربی جمہوریت کو رواج دیا اور اس کے تحت آئین تشکیل دیا اور عدلیہ کا نظام وضع کیا۔ ہمارے نزدیک اس غیر اسلامی صورتِ حال کی اتنی ہی ذمہ دار دینی قوتیں خصوصاً دینی سیاسی جماعتیں بھی ہیں جنہوں نے معمولی درخ اندوزی سے مغرب کی الحادی اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کو 'اسلامی جمہوریت' قرار دیا اور پھر اس کے ذریعے ملک میں اسلامی نظام اور نفاذِ شریعت کے خواب دیکھنے شروع کیے۔ ان کی اس وینچر (Ventune) یا اجتہاد کے دو نتیجے نکلے: ایک یہ کہ وہ اپنی جدوجہد میں ناکام ہو گئے اور دوسرے یہ کہ معاشرے اور ملک میں اسلام کی بجائے مغربی فکر وتہذیب کی تعلیمات اور اقدار (خصوصاً سیکولرزم، لبرل ازم اور سرمایہ دارانہ نظام کی اقدار) غالب آ گئیں۔

ہمارے نزدیک یہ منطقی نتیجہ ہے دینی قوتوں کی غلط فکر کا لیکن افسوس کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے باوجود (جس کا اظہار ہماری عدلیہ کے حالیہ غیر اسلامی فیصلوں میں ہوا ہے اور جو ہماری اس تحریر کا محرک بنے ہیں) ہمارے دینی عناصر اس کشادہ ظرفی اور علمی وسعت سے محروم ہیں کہ اپنے فکری موقف پر نظر ثانی کریں اور متبادلات پر غور کریں بلکہ ان کی حالت تو یہ

ہے کہ ہم نے چند ہفتے پہلے اس حوالے سے مولانا مودودیؒ کی فکر سے اختلاف کیا تو جماعت اسلامی کے جذباتی لوگ ہمیں مارنے کو دوڑے اور اگر ہم نے ۲۲ نکات مرتب کرنے والے علماء کو اس کا ذمہ دار ٹھہرادیا تو مدارس و مسالک کے علماء بھی لٹھ لے کر ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے کہ تم ہوتے کون ہو ہمارے بڑوں کی غلطیاں نکالنے والے؟

❁ قارئین کرام! ہم آج کی اس نشست میں سوال اٹھانے پر اکتفا کرتے ہیں اور ملک کے سنجیدہ و جہاندیدہ عناصر، علماء کرام اور اہل علم و دانش سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ان سوالات کی نزاکت اور ان کے سنگین نتائج پر غور کریں گے، صورتِ حال کا صحیح تجزیہ کریں گے اور متبادل فکری آپشنز پر غور کریں گے۔

سیاستدانوں اور حکمرانوں سے تو ہم زیادہ پر اُمید نہیں اور مغربی قوتوں سے ہم کیوں توقع کریں کہ وہ اسلام اور مسلم دشمنی سے باز آجائیں گی لیکن حرمت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے ہمیں زیادہ دکھ علماء کرام اور دینی عناصر کے رویے سے ہے کہ انہوں نے اس معاملے کو وہ اہمیت نہیں دی جس کا یہ مستحق تھا۔ ہم اپنا یہ موقف دہراتے ہیں کہ ہمارے نزدیک محبت وحرمت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت مسلمہ کا پہلا نہیں آخری مورچہ ہے۔ لہٰذا اگر مسلمان اس کے تحفظ میں بھی ناکام رہتے ہیں تو انہیں سوچنا چاہیے کہ علماء و دینی عناصر اسلامی انقلاب اور نفاذ شریعت کے محاذ سے پسپا ہو کر پلٹے تو تحفظ اسلامی قوانین و روایات پر آٹھہرے لیکن اگر انہوں نے اپنے اپنے سیاسی مفاد، مالی مفاد اور مسلکی مفاد کو سامنے رکھا، اخلاص و فراست سے محرومی کو گوارا کیا، منتشر رہے، متحد نہ ہوئے اور منظم ہو کر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حرمت و محبت کے لیے کامیاب تحریک نہ چلائی تو وہ یاد رکھیں کہ اب ان کے پاس پسپائی کا اور کوئی مقام نہیں بلکہ ان کے پیچھے زوال، ذلت اور رسوائی کی گہری کھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے۔

اسلام اور پاکستان مدیر

واقعۂ ساہیوال - کیوں پیش آیا؟

اسٹیبلشمنٹ کو اپنی سوچ بدلنی چاہیے اور سی ٹی ڈی کو ختم کر دینا چاہیے

واقعہ ساہیوال کی مذمت ہر کوئی کر رہا ہے جس میں دہشت گردی کے خلاف قائم کی گئی خصوصی فورس 'سی ٹی ڈی' (Counter Terrorism Department) نے بے گناہ والدین کو چھوٹے بچوں کی موجودگی میں بھون ڈالا۔ لیکن بہت کم لوگوں نے اس پر غور کیا ہوگا کہ سی ٹی ڈی کیوں قائم کی گئی تھی اور یہ اب تک کیوں قائم ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ساہیوال میں جو کچھ ہوا وہ پوری فلم کا محض ایک سین تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ امریکہ نے بھارت اور افغانستان کی مدد سے داڑھی والوں کے ذریعہ پشاور سکول میں جو دہشت گردی کرائی تھی اس کا ایک ہدف یہ بھی تھا، جو اس نے حاصل کر لیا کہ امریکہ کے خلاف افغانستان میں جہاد سے دلچسپی رکھنے والے دینی عناصر کی سرکوبی کی جائے۔ چنانچہ 'دہشت گردی' کے خلاف کام کرنے والی خفیہ اور علانیہ تنظیموں نے بہت سے دین دار لوگ اسی جرم بے گناہی میں اٹھا لیے اور انہیں 'Missing Persons' (یعنی مفقود اشخاص) کا 'خوبصورت نام' دے دیا گیا۔ ہماری یہ صورتِ حال تب سے اب تک جاری ہے اور شاید امریکہ کے افغانستان سے جانے کے بعد بھی جاری رہے کیونکہ شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار اور فکری غلاموں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ امریکہ میں نئے صدر کی حکومت نے طالبان افغانستان کے خلاف پہلے یہ پالیسی اپنائی تھی کہ افغانستان، پاکستان اور عالم اسلام کی مذہبی قوتوں کو طالبان افغانستان کے جہادی موقف کے خلاف متحرک کیا جائے چنانچہ جکارتہ، قاہرہ، کابل، اسلام آباد اور امریکہ کے زیر اثر دیگر خطوں میں اس ضمن میں کئی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ پاکستان میں جو کام ہوا وہ 'پیغام پاکستان' کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ امریکی پالیسی زیادہ موثر ثابت نہ ہوئی اور امریکہ کے بندے بدستور افغانی طالبان کے ہاتھوں مرتے رہے اور لاکھوں ڈالر روزانہ خرچ

بھی ہوتے رہے لہٰذا ٹرمپ حکومت نے اس پالیسی سے آگے بڑھ کر براہ راست طالبانِ افغانستان سے صلح کی بات چیت شروع کر دی اور اب خبریں آ رہی ہیں کہ وہ افغانستان سے آبرومندانہ نکلنے ہی کو غنیمت سمجھ رہا ہے اور طالبان سے مفاہمت ہوگئی ہے۔ لیکن ہماری اسٹیبلشمنٹ کی حالت یہ ہے کہ ابھی تک امریکہ کی پرانی پالیسی ہی پر عمل پیرا ہے چنانچہ 'پیغام پاکستان' مرتب کرانے کے لیے ادارہ تحقیقات اسلامی اور اسلامی نظریاتی کونسل میں اپنے ڈھب کے سربراہ مقرر کیے گئے، پھر ان کے ذریعے علماء واسلامی سکالرز کو گھیر گھار کر ان سے 'پیغامِ پاکستان' کی تائید کرائی گئی۔ اور اب ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) اور ادارہ تحقیقات اسلامی کی مدد سے بڑے مدارس اور یونیورسٹیوں میں اس 'پیغام پاکستان' کو عام کرنے کے لیے علمی کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کرائے جا رہے ہیں۔ یونیورسٹی آف گجرات کے شعبہ علوم اسلامیہ میں کئی روزہ پروگرام ہوا اور اب بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان میں ایک کانفرنس ہو رہی ہے۔ ان کانفرسوں میں ڈھکے چھپے مغرب زدہ، سیکولر، حکومتی اور بعض سادہ لوح اسلامیات کے پروفیسر اور علماء خوب حصہ لے رہے ہیں۔

ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کو نئے حالات کے مطابق اپنی پالیسی پر نظرثانی کرنی چاہیے اور سی ٹی ڈی کو بند کر دینا چاہیے۔ افراد کو اٹھانے اور غائب کرنے کا سلسلہ ختم کر کے پہلے سے اٹھائے گئے افراد کو رہا کر دینا چاہیے اور 'پیغامِ پاکستان' کو عام کرنے کے لیے مدارس اور یورنیورسٹیوں کو استعمال کرنے کا سلسلہ بھی بند کر دینا چاہیے۔ غلامی ہی کرنی ہو تو اس میں بھی اپ ٹو ڈیٹ رہنے میں کیا حرج ہے؟

اسلام اور پاکستان مدیر

سیاحت اور ثقافت کا فروغ ۔مگر کس قیمت پر؟

’تبدیلی سرکار‘ نے ملک میں سیاحت اور ثقافت کو فروغ دینے کے لیے ایک بھرپور پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ملک کے دین دار اور سنجیدہ لوگ تحریک انصاف کے جلسوں کے رنگ ڈھنگ سے ہی سمجھ گئے تھے کہ اس نئی سیاسی تحریک کا مزاج کیا ہے جس کے سیاسی جلسوں میں گانے بجانے کے لیے باقاعدہ پروفیشنل افراد لاکھوں کے خرچے پر بلوائے جاتے، نوجوان لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی جلسوں میں لایا جاتا، پھر موسیقی کی دھنوں پر جسم بھی حرکت میں آتے۔ اب یہ ’تبدیلی سرکار‘ ثقافت کو فروغ دینے کے نام پر اس ناچ گانے کو منظم کرنا چاہتی ہے اور عام کرنا چاہتی ہے۔ گویا اب سرکاری بجٹ کے ساتھ اور کالجوں یونیورسٹیوں میں رقص وسرود کو فروغ دیا جائے گا، یونیورسٹیاں اس پر ڈگریاں دیں گی، ڈانس اکیڈمیاں کھلیں گی اور یوں ناچ گانے کا کلچر معاشرے میں فروغ پائے گا اور بے حیائی وعریانی کو عام کیا جائے گا۔

ایک نئی تبدیلی یہ لائی جارہی ہے کہ سیاحت کو فروغ دے کر ڈالر کمائے جائیں تاکہ ملک غریبی کی دلدل سے نکل سکے۔ اس کے لیے ویزا پالیسی فری بنائی جارہی ہے تاکہ جو بھی گورا اور کالا پاکستان آنا چاہے اسے ویزہ لینے کی سردردی مول نہ لینا پڑے۔ کیا عمران خاں نہیں جانتے یا جان بوجھ کر بھولے بننا چاہتے ہیں کہ جہاں سیاحت آتی ہے وہاں شراب اور شباب کا تقاضا بھی ساتھ آتا ہے۔ کیا عمران خاں کی حکومت شمالی علاقوں کی خوبصورتی کی یہ قیمت لگانا چاہتی ہے کہ وہاں بے حیائی پھیلے اور ہوٹل چکلے بن جائیں؟ شمالی علاقوں کے مسلمان غریب ضرور ہیں لیکن ان کی عورتیں پردہ کرتی ہیں اور باحیا و باعفت ہیں۔

عقل کے اندھے اور مغرب زدہ حکمرانوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا (حالانکہ ہم انہیں بارہا البرہان میں توجہ دلا چکے ہیں) کہ قبائلی علاقوں میں اور سرحد و بلوچستان میں لڑکیوں کی شرح تعلیم اس لیے کم نہیں ہے کہ وہاں کے لوگ جاہل اور ذہنی طور پر پسماندہ ہیں اور اپنی

لڑکیوں کو تعلیم نہیں دلوانا چاہتے بلکہ اس لیے کم ہے کہ وہاں کے غیرت مند لوگ اس مغرب زدہ نظامِ تعلیم کو پسند نہیں کرتے جوان کی بچیوں کو بے حیائی، بے پردگی اور غیر اسلامی اقدار کا درس دیتی ہے۔ ہم حکمرانوں سے کہتے ہیں کہ اگر وہ نظام تعلیم کو ایسا بنا دیں جو مسلمان بچیوں کو حیا اور عفت کی تعلیم دے (جو کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم کو لازماً دینی چاہیے) اور انہیں مغرب زدہ نہ بنائے تو سرحد و بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں لڑکیوں کی شرح تعلیم میں بے حد اضافہ ہو جائے گا لیکن مغرب زدہ حکمرانوں کی سمجھ میں ہماری یہ بات نہیں آتی۔

اب عمران خاں کی حکومت فروغ سیاحت کے نام پر وہاں بے حیائی کا ماحول بنانا چاہتی ہے تو یہ ان لوگوں کو مزید 'شدت پسند' بنائے گی اور بعید نہیں جس طرح اب وہاں سکول جلائے جاتے ہیں اسی طرح سیاحوں کے ہوٹلوں پر بھی حملے شروع ہو جائیں۔ آپ 'دہشت گردی' کے پیچھے بھاگتے پھریں اور سیاحت سے ڈالر بھی نہ ملیں۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں۔

اسلام اور مغرب

پروفیسر محمد رفعت

اسٹیفن ہاکنگ کے نظریات کا تنقیدی جائزہ

سائنس سے وابستہ بعض شخصیات ایسی ہیں جو سائنسی دنیا کے باہر بھی مشہور ہوئیں۔ ان شخصیات میں اسٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking) کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ کی پیدائش ۱۹۴۲ء میں ہوئی اور ۲۰۱۸ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کا تعلق انگلینڈ سے تھا۔ اپنی علمی اور تحقیقی خدمات اس نے کیمبرج یونیورسٹی میں انجام دیں۔ اگر ہم اس سوال پر غور کریں کہ سائنس اور اس کی شاخ فزکس میں ہاکنگ نے کیا کارنامہ انجام دیا تو چند عنوانات ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔

شہرت کا سبب

ہاکنگ نے جن موضوعات پر کام کیا ان میں سب سے اہم قعر اسود (بلیک ہول) کا موضوع ہے۔ اس نے اس مسئلے کی تحقیق کے لیے بیسویں صدی کے سائنسی نظریات کا استعمال کیا۔ اس سے اتنی بات واضح ہے کہ اس کی گرفت سائنس اور طبیعیات کے تصورات پر بہت مضبوط تھی۔ سائنس کے نظریات کو سمجھنے میں اس کی تحقیقی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، البتہ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ اس کی شہرت کی اصل وجہ کیا ہے؟ تو یہ اس کا سائنسی کارنامہ نہیں معلوم ہوتی۔ واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں سائنس کی دنیا میں ہاکنگ سے کہیں زیادہ اہم کام کرنے والی دوسری شخصیات موجود تھیں۔ اگر کوئی فہرست تیار کی جائے کہ اس صدی میں کن اہل تحقیق کا کام فزکس کی دنیا میں نمایاں اہمیت رکھتا ہے تو ہاکنگ کا نام پہلے یا دوسرے نمبر کی بجائے شاید بیسویں نمبر پر آئے گا، لیکن اس کے باوجود اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

اس دنیا میں شہرت کیسے حاصل ہوتی ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی طے کرتی ہے کہ کون مشہور ہوگا اور کون گمنام؟ تاہم اگر غور کیا جائے کہ اسٹیفن ہاکنگ کی شہرت کی کیا وجہ تھی؟ تو چند باتیں سمجھ میں آتی ہیں:

زندگی کے درمیانی دور میں، جب ہاکنگ جوان ہی تھا، اس پر فالج کا حملہ ہوا اور جسم کا بڑا

حصہ کام کرنے کے لائق نہیں رہا۔ پھر اس کیفیت کا اثر جسم کے باقی حصوں پر بھی پڑا۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ بولنے کی طاقت بھی ختم ہوگئی، لیکن انگلیوں اور آنکھوں کی حرکت کی مدد سے اس کے لیے کمپیوٹر کا استعمال ممکن رہا۔ کمپیوٹر کو اس طریقے سے ترتیب دیا گیا کہ وہ ہاکنگ کی انگلیوں اور آنکھوں کی حرکت کے ذریعہ کام کرتا تھا۔ اس طرح اس نے کتابیں بھی لکھیں اور علمی تحقیق بھی کی، نتائجِ تحقیق دنیا کے سامنے بیان کیے اور سائنس کے موضوعات کا عام فہم تعارف بھی کرایا۔

چنانچہ بظاہر شہرت کا سبب ہاکنگ کی غیر معمولی زندگی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کی جسمانی طاقت بہت کم تھی، فالج کی وجہ سے وہ بولنے اور لکھنے کا کام براہ راست نہیں کرسکتا تھا۔ اسے کمپیوٹر کی مدد لینی پڑی۔ ان غیر معمولی مشکلات کے باوجود اس نے اول درجے کی تحقیق کی اور اپنے خیالات اور تحقیقات کا عام فہم تعارف بھی کرایا۔ یہ سب امور کشش کا باعث ہیں۔ اس کی غیر معمولی محنت، عزم، ارادہ اور تسلسل کے ساتھ کام اور جسمانی صلاحیت متاثر ہوجانے کے باوجود اس کی سرگرم زندگی میں ہمارے لیے سبق موجود ہے۔ سبق یہ ہے کہ ہم زندگی کی مشکلات سے نہ گھبرائیں، بلکہ عزم اور ارادے کے ساتھ مشکلات پر قابو پائیں۔

ہاکنگ کی مقبول کتاب

علمی دنیا میں ایسی موو (Asimov) کا نام معروف ہے، جس نے سائنس کے تصورات کا سہارا لے کر مستقبل کی دنیا کی تصویر سائنسی کہانیوں کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ Asimov کو سائنس فکشن یعنی سائنسی کہانیاں لکھنے کے میدان میں شہرت حاصل ہے۔ اس کی کہانیوں میں مشینی دماغ یعنی روبوٹ سے متعلق کہانیاں بھی موجود ہیں۔ ان داستانوں میں ایسی دنیا کا تصور پیش کیا گیا ہے جس میں مفلوج افراد جن کی جسمانی صلاحیتیں کمزور ہوں یا ختم ہوگئی ہوں، روبوٹ کا سہارا لے کر اپنے کام کرسکتے ہیں۔ گویا روبوٹ ان کی جسمانی کمی پوری کردیتا ہے۔ یہ تو کہانی کی بات ہے، لیکن ہاکنگ کی زندگی میں یہ افسانہ حقیقت کی شکل میں نظر آتا ہے۔

ہاکنگ کے علمی اور تحقیقی کام کا تعلق ایک خاص سائنسی موضوع سے ہے، جس کو قعر اسود

(بلیک ہول) کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے دیگر سائنسی موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا اور تحقیقات کیں۔ اس نے سائنس کے تصورات اور تحقیقات کو عام فہم اور مقبول بنانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اس کی ایک کتاب زیادہ مشہور ہوئی جس کا نام ہے A Brief History of Time یعنی وقت کے تصور کی مختصر تاریخ۔ یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی اور اپنے زمانے میں اسے سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب کی حیثیت حاصل ہوئی۔ کتاب کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا اور بڑے پیمانے پر خریدی اور پڑھی گئی۔

اس کتاب کی اشاعت کے چند سال بعد اس نے اسی کتاب کا خلاصہ ''تصور وقت کی مختصر تر تاریخ'' کے نام سے لکھا، جس میں سائنسی تصورات کی عام فہم تفہیم کی کوشش کی۔ یہ تحریریں ہاکنگ کے نمایاں کاموں میں شامل ہیں۔ اس نے کائنات کی ابتدا، خدا کے تصور اور خدا اور کائنات کے تعلق جیسے موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ یہ موضوعات عام انسان کی دلچسپی کے موضوعات ہیں، چاہے وہ سائنس نہ جانتا ہو۔ ہر شخص بہرحال کائنات اور خدا کے بارے میں سوچتا ہے، ہاکنگ کی تحریروں کے پڑھنے والوں نے خدا اور کائنات کے بارے میں اس کے خیالات پر بھی توجہ دی۔

غالباً بیسویں صدی میں صرف آئن اسٹائن (Einstein) ایسی دوسری شخصیت ہے جس کو اتنی زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ بیسویں صدی سائنس اور فزکس کی دنیا میں بعض انقلابی تبدیلیوں کی حامل صدی تھی۔ سائنس کے تصورات میں تبدیلیاں تو ہمیشہ ہوتی رہی ہیں، لیکن بعض اوقات یہ تبدیلیاں بڑی ہمہ گیر نوعیت کی ہوتی ہیں، جن کا علمی دنیا پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ تحقیق طلب سوالات، انداز گفتگو اور اندازِ بیان سب بدل جاتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں کہ بیسوی صدی کی فزکس اور سائنس میں ہونے والی خاص تبدیلیاں کیا ہیں تو دو قابل ذکر تغیرات سامنے آتے ہیں:

بیسویں صدی کی اہم سائنسی تبدیلیاں

ایک تبدیلی تو وہ ہے جسے Relativity کا نظریہ کہا جاتا ہے، یعنی نظریۂ اضافیت۔ اس کو ابتدائی اور مربوط شکل میں آئن اسٹائن نے ۱۹۰۵ء میں پیش کیا۔ آئن اسٹائن کا تعلق جرمنی

سے تھا۔ جب جنگ عظیم کے بعد جرمنی میں یہودیوں کا رہنا مشکل ہو گیا تو وہ امریکا میں جا بسا۔ ۱۹۰۵ء میں آئن اسٹائن نے اپنا نظریۂ اضافیت پیش کیا جس کو Special Theory of Relativity کہا جاتا ہے، یعنی آئن اسٹائن کے اضافیت کے نظریہ کا خاص پہلو۔ اس کے دس سال بعد ۱۹۱۵ء میں آئن اسٹائن ہی نے عام (یا جامع) نظریۂ اضافیت (General Theory of Relativity) پیش کیا، جو سابق نظریے کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ نظریہ اضافیت کی تشریح کرنے، اس کو سمجھنے اور اس کو بیان کرنے میں بہت سے لوگوں نے حصہ لیا ہے۔ ایسے شارحین کی تعداد کم نہیں، بلکہ سیکڑوں میں ہے، لیکن اصل تحقیقی کام اور بنیادی تصورات آئن اسٹائن کے پیش کردہ ہیں۔ بیسویں صدی کی فزکس میں یہ ایک نمایاں اور انقلابی تبدیلی تھی جو واقع ہوئی، یعنی نظریۂ اضافیت کی تخلیق۔

دوسری نمایاں تبدیلی وہ ہے جسے کوانٹم نظریہ یا کوانٹم تھیوری (Quantum Theory) کہا جاتا ہے۔ اردو میں اسے نظریۂ مقادیری کہتے ہیں۔ اس نظریہ کو پیش کرنے والا 'پلینک' نامی شخص تھا۔ ۱۹۰۰ء میں پلینک نے اپنے نظریات ابتدائی شکل میں پیش کیے، اس کے چوتھائی صدی بعد تین اہم شخصیات نے اس نظریے کی مربوط تشریح کی، اس میں اہم اضافے کیے اور اس کی تفصیل بیان کی۔ یہ تین شخصیات ہیں شروڈنگر (Schrodinger)، ہازن برگ (Heisenberg) اور ڈراک (Dirac)۔

اضافیت اور تصور کوانٹم دو نظریات ہیں، جنہوں نے بیسویں صدی کی فزکس اور سائنس پر انقلابی اثرات ڈالے اور سائنسی طرزِ فکر میں نمایاں تبدیلیاں کیں، جن کا اثر انسانوں کے عام فلسفیانہ تصورات پر بھی پڑا۔ وہ تبدیلیاں کیا ہیں؟ یہ جاننے کے لیے بیسویں صدی سے پہلے سائنس کی دنیا میں رائج تصورات کا جائزہ لینا ضروری ہے، تاکہ پس منظر سامنے رہے۔ مظاہر کائنات کو سمجھنے کے لیے بیسویں صدی سے پہلے مقبول سائنسی تصورات وہ تھے جو اصلاً نیوٹن نے پیش کیے تھے۔ نیوٹن کا دور آج سے ۳۰۰ سال قبل کا ہے۔ (نیوٹن کا تعلق انگلینڈ سے تھا) نیوٹن کی مشہور کتاب ۱۶۸۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا مختصراً نام پرنسپیا (Principia) ہے، جو ریاضی اور فزکس سے متعلق نیوٹن کی تحقیقات پر مشتمل ہے۔ یہ دقیق کتاب ہے، آج بھی اس کو پڑھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

نیوٹن کا کارنامہ

یہ کتاب ۱۶۸۷ء میں شائع ہوئی اور دو صدیوں تک سائنسی دنیا پر چھائی رہی۔ آج بھی اس کے اثرات جوں کے توں موجود ہیں۔ عصر حاضر کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی تفصیلات کا جائزہ لیں تو اس کا دو تہائی حصہ ایسا ہے جس کی کامیاب تفہیم نیوٹن کے تصورات کی مدد سے ہی کی جاتی ہے۔ ان تصورات سے زیر مشاہدہ دنیا کی ایک خاص تصویر ذہن میں ابھرتی ہے۔ نیوٹن کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ تثلیث کا قائل نہیں تھا۔ خاندانی پس منظر کے اعتبار سے وہ عیسائی تھا، لیکن تثلیث کی بجائے وہ توحید کا قائل تھا۔ ایک قادر مطلق خدا پر یقین رکھتا تھا۔ اس کی سائنسی تحقیقات ریاضی اور فزکس پر مرکوز تھیں، لیکن یہ اس کی دلچسپی کے اصل موضوعات نہیں تھے۔

مذکورہ بالا کتاب نیوٹن نے اس وقت لکھی جب اس کی عمر ۴۵ سال کی ہو چکی تھی۔ اس میں جو تحقیقات بیان کی گئی ہیں وہ کتاب کی اشاعت سے کافی پہلے اس کی گرفت میں آ چکی تھیں، جب اس کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ بظاہر اس کا کوئی ارادہ کتاب شائع کرنے کا نہیں تھا۔ اپنے دوستوں کے اصرار پر اس نے یہ کتاب تحریر کی۔ اس کی دلچسپی کا اصل موضوع تو کیمیائی تجربات تھے اور ان سے بھی زیادہ اسے بائبل سے دلچسپی تھی، وہ بائبل کا بڑا عالم تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا باقی حصہ بائبل کو سمجھنے میں اور اس کے رموز کو جاننے میں گزارا۔ اپنی زندگی میں وہ خدا پرست انسان نظر آتا ہے۔

تحقیق کے میدان میں اس نے جو کچھ پیش کیا ہے اسے خدا کے تصور سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ ہم جانتے ہیں کہ وقت کی غالب فلسفیانہ فضا سے کوئی بھی شخص آزاد نہیں رہ پاتا، چاہے نیوٹن جیسا عظیم ماہر ہی کیوں نہ ہو؟ اپنے ذاتی تصورات کے لحاظ سے خدا پرست ہونے کے باوجود اس نے جو کچھ پیش کیا اس میں مغرب کی دنیا کے اثرات نظر آتے ہیں، جہاں الحاد کا رجحان غالب تھا۔ مزید برآں مغربی دنیا نے نیوٹن کے تصورات کو اس طرح استعمال کیا کہ وہ الحاد کی تائید کرتے ہوئے نظر آئے۔

الحاد کے رجحان کی تائید کی ایک مثال دی جاسکتی ہے۔ نیوٹن کے تصورات کی تشریح

کرنے والے بہت سے محققین نے اپنی کاوشیں پیش کیں۔ نیوٹن کے ایک صدی بعد ان شارحین میں ہمیں ایک اہم نام ریاضی دان Laplace کا نظر آتا ہے۔ اس کا طرزِ فکر یہ ہے کہ اس دنیا میں فطری قانون موجود ہے، جو مظاہر کائنات کی تفہیم کے لیے کافی ہے۔ خداوند قدوس کا کام صرف اتنا ہے کہ اس نے کائنات کی ابتدا کردی۔ اس کے بعد کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ فطری قوانین کی کارفرمائی کی بناء پر خود بخود ہوتا چلا جا رہا ہے۔ نیوٹن کے پیش کردہ تصورات بنیادی قوانین فطرت کو بیان کرتے ہیں۔ اس تعبیر کے مطابق اگر ہم اس وقت کی (کائنات کی) صورتحال کو جانتے ہوں (مشاہدہ کے ذریعہ) تو کائنات کا ماضی کیا تھا؟ یہ بھی بتا سکتے ہیں اور مستقبل کیا ہوگا؟ یہ بھی بتا سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ہمیں قوانین فطرت کا درست فہم حاصل ہو۔

اس وقت سائنس کی دنیا میں یہ خوش فہمی عام تھی کہ نیوٹن کی تحقیقات کے بعد اب قوانین فطرت کا علم ہمیں حاصل ہو چکا ہے اب کچھ راز میں نہیں رہ گیا ہے۔ ہم قابل مشاہدہ مظاہر میں کارفرما قوانین کی تلاش کے آخری مراحل تک پہنچ گئے ہیں۔ کائنات کی کنجی ہم نے پالی ہے۔ یہ وہ بات تھی جو اٹھارویں صدی میں مقبول تھی، لیکن حقیقت حال ایسی نہ تھی۔ جلد معلوم ہوگیا کہ نیوٹن نے جو کچھ پیش کیا تھا وہ نت نئے مشاہدات کی تشریح وتفہیم کے لیے کافی نہ تھا، بلکہ انیسویں صدی کے وسط تک مظاہر کائنات سے متعلق فزکس کی دنیا میں وہ مشاہدات بھی سامنے آچکے تھے جن کی تشریح محض مشینی قوانین کے ذریعہ سے نہیں کی جا سکتی تھی۔

مظاہر فطرت میں جو پہلی چیز انسان کی توجہ مبذول کرتی ہے وہ فلکیات کی دنیا ہے، جو ہم سے بہت دور ہے۔ انسان زمین کا مشاہدہ تو ذرا بعد میں کرتا ہے لیکن چانداور سورج کا پہلے کرتا ہے۔ مغرب میں سائنس کی نئی ابتدا سولہویں صدی میں ہوئی۔ اس مرحلے میں فلکیات سے نئے سائنسی تصورات کا آغاز ہوا۔ پرانے مشاہدات، جو چاند، سورج اور سیاروں سے متعلق تھے ان کو از سرنو ترتیب دیا گیا اور مربوط تشریح پیش کرنے کی کوشش کی گئی، جو پہلے کی تشریح سے بہتر ثابت ہو سکے۔

علم فلکیات

نئی سائنس میں اجرام فلکی کی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ نیوٹن کے نقطۂ نظر کی ندرت

یہ ہے کہ اس نے حرکت کی جامع تعبیر تلاش کی۔ اس نے توجہ دلائی کہ سورج اور چاند کی طرح زمین کی چیزیں بھی حرکت کررہی ہیں۔ زمین پر بہت سی اشیا ہمیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ان میں بطور مثال ذرّات ہیں اور ہوا کی گردش ہے۔ نیوٹن کے مطابق حرکت کی ماہیت ایک جیسی ہے اور جہاں بھی حرکت موجود ہو، اس کے قوانین یکساں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ آسمان میں متحرک اجسام کے لیے کچھ قوانین ہوں اور زمین پر کچھ اور ہوں۔ سائنس کی دنیا میں یہ ایک نادر خیال تھا جو پیش کیا گیا۔ اس سے پہلے لوگ یہ کہتے تھے کہ فلکیات کی دنیا الگ ہے اور زمین کے معاملات الگ۔ دونوں کے سلسلے میں الگ الگ طرز پر سوچنا چاہیے۔

نیوٹن کے تجویز کردہ نظام تصورات میں حرکت اور ذرّات کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ اس رجحان کو تقویت ایک قدیم تصور سے حاصل ہوئی، جسے ماضی میں متعدد لوگوں نے پیش کیا تھا، یعنی ایٹم کا تصور۔ کہا جاتا ہے کہ یونانیوں نے آج سے مدتوں پہلے ایٹم کے بارے میں سوچا۔ جدید مغرب نے نشاۃ ثانیہ میں اسے دوبارہ دریافت کیا اور ڈالٹن کا نظریہ ایٹم سامنے آیا۔ وہ یہ کہ مادی چیزیں ایٹموں پر مشتمل ہیں، جو ہمیں نظر نہیں آتے۔ مگر بہر حال ان کا وجود ہے۔ ان کے وجود کی تائید کرنے والے شواہد دریافت کیے گئے ہیں۔

کائنات کے مشینی تصور کے نقائص

نیوٹن کے نظامِ تصورات میں ذرّات کی حرکت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دنیا میں ذرّات کی موجودگی اور حرکت کا ظہور ایسی بنیادی حقیقتیں ہیں جو مظاہر کی تشریح میں مدد دیتی ہے؟ پھر یہ کہ روشنی کیا ہے؟ نیوٹن کا کہنا یہ ہے کہ جو روشنی ہم دیکھ رہے ہیں وہ بھی ذرّات ہی پر مشتمل ہے۔ اس کے خواص کو اس تصور کے تناظر میں بیان کیا جاسکتا ہے، مثلاً سیدھی لائن میں روشنی کا چلنا۔ اس خصوصیت کی توجیہ کے لیے ہم ذرّات کی خاصیتوں کو کافی سمجھتے ہیں۔ ذرّات کے ذریعہ روشنی کی خصوصیات کی تشریح کی جاسکتی ہے۔

مندرجہ بالا دعوؤں اور Laplace جیسے راسخ العقیدہ سائنس دانوں کے خیالات کے باوجود (جو سائنس کے تصورات پر گویا ایمان لے آئے تھے) انیسویں صدی کے وسط تک ایسے مشاہدات سامنے آچکے تھے (خاص طور پر روشنی اور بجلی کے سلسلے میں) جن کی تشریح مشینی تصور کائنات سے نہیں ہوسکتی تھی، جو اس وقت رائج تھا۔ یعنی اگر ہم یہ کہیں کہ کائنات میں

ذرّات اور ان کی حرکت کے علاوہ کچھ اور موجود نہیں تو ہم نہ روشنی کی تشریح کر سکتے ہیں نہ بجلی کی۔ ہم ان خصوصیات کو نہیں سمجھ سکتے جو روشنی سے متعلق ہیں۔ انیسویں صدی کی سائنس پر مشینی تعبیرات چھائی ہوئی تھیں، لیکن اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے محققین نے یہ سمجھ لیا کہ نیوٹن کے تصورات کافی نہیں۔ ان کے ساتھ ہمیں کچھ اور نئی تعبیرات اور نئے تصورات کی بھی ضرورت ہے۔ بلاشبہ ذرّات موجود ہیں، ان کی حرکت بھی ایک حقیقت ہے، لیکن یہ کُل کائنات نہیں۔ بطور مثال اس دنیا میں لہروں (Waves) کا وجود بھی ہے۔

کوانٹم نظریہ

بیسویں صدی آئی تو مزید نئے چیلنج ساتھ لائی۔ آپ چاہے ذرّات کا ذکر کریں یا لہروں کا، مگر اب تک کی سائنس کے مطابق دونوں مظاہر فطرت میں ایک مشترک خصوصیت موجود تھی، جس کو Laplace نے بڑی اہمیت دی تھی کہ اصلاً بس قوانین فطرت ہیں، جن کی بدولت دنیا میں تبدیلیاں خود بخود ہوتی جاتی ہیں۔ اگر کسی صاحب ارادہ ہستی (مثلاً خداوند قدوس) کا تدبیر کائنات میں کوئی رول یا کردار ہے تو محض تخلیق کی ابتدا کرنے کا ہے۔ لیکن بیسویں صدی آئی تو سائنس 'کوانٹم نظریہ' سے آشنا ہوئی۔ اس نظریے نے ایک نیا سوال پیدا کر دیا کہ کیا حقیقت (خارجی دنیا میں فی الواقع) موجود ہے اور ہم محض اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، یا ہمارے مشاہدات سابقہ صورتحال کو بدل سکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں ردعمل دو طرح کا ہوسکتا ہے: ایک موقف یہ ہے کہ کائنات تو جیسی کچھ ہے، خارج میں موجود ہے، ہم انسان محض اس کا مشاہدہ کرنے والے ہیں۔ صورتحال ہمارے مشاہدے سے بدلتی نہیں ہے، جب تک ہم مشاہدات کے دائرے میں انسانی دنیا کو شامل نہ کریں۔ بظاہر یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال مشاہدے اور مشاہد کی دوئی کا یہ دعویٰ ان لوگوں کا نہیں تھا جو انسانی دنیا کی تشریح کر رہے تھے، بلکہ یہ دعویٰ ان محققین کا تھا جو (بظاہر) بے جان دنیا کے مظاہر کے بارے میں تحقیق کر رہے تھے۔ ان کا ادّعا یہ تھا کہ اس بے جان دنیا میں حقیقت ہمارے مشاہدے سے بے نیاز ہے۔ وہ ہمارے دیکھنے سے نہیں بدلتی۔ مگر کوانٹم نظریے نے اس مقبول عام خیال کو رد کر دیا۔ جیسے جیسے کوانٹم نظریہ ترقی کرتا گیا، یہ بات زیادہ نمایاں ہوتی چلی گئی کہ ہمارے

مشاہدات واقعات کو بدل سکتے ہیں۔ ہمیشہ یہ ممکن نہیں کہ زیر مشاہدہ چیز اور دیکھنے والے کے درمیان ہم ایسی لکیر کھینچ سکیں جو دونوں میں واضح امتیاز کر دے۔ غالب نے کوانٹم نظریہ کے ظہور سے پون صدی قبل فلسفۂ وحدت الوجود کے زیر اثر یہ بات کہی تھی ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ابتدائی سوال کے جواب میں یہ دوسرا موقف ہے جو کوانٹم نظریہ نے تجویز کیا۔ یہ حقیقت تسلیم کی گئی کہ جب انسان سائنس کے اس شعبے کا (مشاہدے کے ذریعے) مطالعہ کرتے ہیں جو ایٹموں اور ذرّات کی دنیا سے متعلق ہے (جو براہ راست آنکھوں سے نظر نہیں آتی، مگر جس کا بالواسطہ مشاہدہ ممکن ہے) تو وہاں انسانی مشاہدے سے واقعات بدل سکتے ہیں۔ یہ سائنس کے تصورات میں ایک انقلابی تبدیلی ہے جس نے مشینی تصور کائنات کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

کائنات میں ذرّات کی موجودگی کو نیوٹن نے بڑی اہمیت دی تھی۔ دوسرے مفکرین نے نیوٹن کے نظام تصورات میں لہروں کی تشریح کی گنجائش نکالی۔ تاہم انیسویں صدی کے اختتام تک یہ سب شارحین یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم قوانین فطرت کو جانتے ہوں تو تفصیلی پیشگوئی کر سکتے ہیں اور بتا سکتے ہیں کہ کائنات میں مستقبل میں کیا ہوگا؟ اور اگر اپنی پیشگوئی کے استدلال کو ماضی کی طرف لے جائیں تو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ ماضی میں کیا ہوا ہوگا؟ لیکن اب کوانٹم نظریہ اس طرز کی پیشگوئی کی اجازت نہیں دیتا۔ اس نظریے کو درست سمجھا جائے تو ہم یہ تو نہیں بتا سکتے کہ مستقبل کیا ہوگا؟ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی خاص مظہر فطرت کے تناظر میں (بطور مثال) دس مختلف طرح کے امکانات ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے، وہ بھی ہوسکتا ہے۔ ہر ایک نتیجے کا کتنے فیصد امکان ہے، اس کا حساب ریاضی کی مدد سے لگا سکتے ہیں، مگر یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں امکان ہی ظہور پذیر ہوگا۔ مثال کے طور پر بہت سارے ایٹم ایسے ہیں جو قدرتی طور پر ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ایٹم کا ایک مرکزی حصہ ہوتا ہے، جسے نیوکلیس کہتے ہیں اس میں سے ذرّات نکلتے رہتے ہیں۔ یورینیم (Uranium) اس کی مثال ہے۔ خود بخود ان ذرّات کا نیوکلیس سے نکلنا ریڈیو ایکٹیوٹی (تابکاری) کہلاتا ہے۔ اس کا استعمال بجلی بنانے میں کیا جاسکتا

ہے، اس کے تخریبی استعمال کے امکانات بھی ہیں۔

تابکاری کی مثال

یورینیم یا اسی طرح کے بعض دوسرے عناصر کے نیوکلیس سے ذرّات نکلتے رہتے ہیں، چنانچہ یورینیم بدل کر بتدریج ایک دوسرا عنصر بن جاتا ہے۔ آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس سو گرام یورینیم آج موجود ہے تو اتنے عرصے بعد سو میں سے ۸۰ گرام باقی بچے گا۔ باقی بدل کر کچھ اور بن چکا ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بیس گرام ابتدائی مادہ ایک دوسرا عنصر بن گیا لیکن سو گرام میں کون سا حصہ کچھ اور بنا؟ یہ ہم نہیں بتا سکتے۔

انسانی دنیا میں اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ ایک گاؤں میں انسانوں کی آبادی ایک ہزار ہے۔ سابق مشاہدات کی بنا پر ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اگلے پانچ سال میں اس گاؤں میں دس لوگوں کا انتقال ہو جائے گا، مگر وہ کون سے دس ہوں گے؟ یہ ہم نہیں بتا سکتے۔ یہاں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جانتے نہیں۔ اللہ کی مشیت کسی فرد کی موت کا وقت طے کرتی ہے اور یہ مشیت ہمارے علم میں نہیں۔

اب تابکار مادے کو لیجیے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم مادی دنیا کے قوانین فطرت کو جانتے ہیں، لیکن اس علم کے باوجود یہ نہیں بتا سکتے کہ اس یورینیم مادے کے کس حصے میں تبدیلی واقع ہوگی اور کون سا جز (یورینیم کے طور پر) باقی رہ جائے گا؟ یہ پیشگوئی کا نقص ہے۔ (پیشگوئی) کی صلاحیت، جو کامل سمجھی گئی تھی وہ حقیقتاً ناقص ثابت ہوئی۔

یہ ایک ہی طرزِ فکر کی دو تعبیریں ہیں۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا مشاہدہ حقائق کو متاثر کرتا ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پیشگوئی مطلق نہیں، یقین نہیں، Certain اور Absolute نہیں ہو سکتی، بلکہ محض امکانی نوعیت رکھتی ہے۔ ہم محض کسی واقعہ کے امکان کو بتا سکتے ہیں، اس کے لازمی ظہور کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ سائنسی تصورات میں یہ ایک انقلابی تبدیلی ہے، جو بیسویں صدی کی دنیا میں سامنے آئی۔

ہاکنگ کا سائنسی کارنامہ

ہاکنگ کی تحقیقات کا ایک اہم جُز قعر اسود یا بلیک ہول سے متعلق ہے۔ قعر اسود کا ابتدائی

تصور تو ہاکنگ کا نہیں ہے (دوسرے لوگ پہلے اسے پیش کر چکے تھے) البتہ اس کو سمجھنے میں ہاکنگ کی تشریحات نے بھی مدد کی ہے۔ کائنات میں ہم سیاروں کے وجود سے واقف ہیں، سورج بھی ایک سیارہ ہے، جو دوسرے سیاروں کے مقابلے میں ہم سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ ہمارے حساب سے تو سورج بہت دور ہے، یعنی نو کروڑ میل یا پندرہ کروڑ کلومیٹر، لیکن اللہ تعالیٰ کی کائنات بڑی وسیع ہے، اس میں پندرہ کروڑ کلومیٹر کا فاصلہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ سورج سے روشنی زمین تک صرف ۸ منٹ میں آجاتی ہے۔ اس کے بعد زمین سے قریب ترین جو سیّارہ ہے اس کو الفاسنٹاری کہا جاتا ہے، اس سے روشنی کو زمین تک آنے میں چار سال لگ جاتے ہیں۔ یہ قریب ترین سیّارے کا معاملہ ہے۔ خدا کی کائنات کی وسعت کے تناظر میں زمین سے سورج کا فاصلہ معمولی فاصلہ ہے۔ سورج نظام شمسی کا مرکز ہے۔ اس نظام میں بہت سارے سیّارے موجود ہیں۔ زمین بھی ان میں سے ایک ہے۔ سورج جیسے بہت سارے سیارے کائنات میں موجود ہیں۔ سیّارے سے روشنی اور گرمی نکلتی ہے تو اس میں موجود توانائی آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتی ہے۔ ایک بڑے لمبے عرصے کے بعد ایسا وقت بھی آتا ہے جب سیّارے کی توانائی بالکل ختم ہو جاتی ہے اور وہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے میں سیّارے کو سائنسی اصطلاح میں White Dwarf کہا جاتا ہے، یعنی وہ سفید وجود کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

قعر اسود

سوال یہ ہے کہ کوئی سیّارہ اس مرحلے تک پہنچ جائے تو اب کیا ہوگا؟ تحقیقات کی بنیاد پر تین امکانات ہیں: ایک امکان یہ ہے کہ وہ پھٹ جائے گا اور منتشر ہو جائے گا، اس کی توانائی دوبارہ یکجا نہیں ہو سکے گی۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ وہ سکڑتے سکڑتے چھوٹا ہوتا جائے گا۔ عام مادہ میں ایٹم ہوتے ہیں اور ایٹم میں الیکٹران، پروٹان جیسے ایٹمی ذرّات ایک دوسرے سے الگ الگ موجود ہوتے ہیں۔ سکڑ جانے والے سیّارے میں ایسا نہیں ہوگا، وہ اتنی چھوٹی شکل اختیار کر لے گا کہ ایٹم کے ذرّات میں سے بس ایک ذرّہ باقی رہ جائے گا، جسے نیوٹرون کہتے ہیں۔ گویا سیّارہ نیوٹرون اسٹار بن جائے گا۔ ایک تیسرا امکان بھی ہے، وہ ہے قعر اسود یا بلیک ہول کا ظہور، یعنی یہ ممکن ہے کہ سیّارہ بلیک ہول بن جائے۔

البتہ بلیک ہول کے ظہور کے لیے شرط یہ ہے کہ سیّارے کا جو ابتدائی وزن تھا وہ ہمارے سورج کے وزن سے کم از کم چالیس فیصد زائد ہو، اس مقدار سے کم نہ ہو۔ سورج کا وزن ہمارے پیمانوں کے مطابق بہت زیادہ ہے۔ کاغذ پر آپ دو کا ہندسہ لکھیں اور اس کے آگے تیس صفر لگا دیں۔ اتنے کلوگرام سورج کا وزن ہے۔ ہماری گنتی سے اس مقدار کو بتایا نہیں جا سکتا۔ یوں سمجھیں کہ وہ دو ہزار ارب، ارب، ارب کلوگرام کا وزن ہے۔ اتنی بڑی مقدار میں اس کا مادہ ہے۔ اس میں چالیس فیصد کا اضافہ کیجیے۔ سیّارے میں کم از کم اتنا مادہ ہو تب وہ قعر اسود یا بلیک ہول بن سکے گا۔ مقدار مادہ کے متعلق یہ جو اندازہ ہے، اس کو چند شیکھر لمٹ کہا جاتا ہے۔ چندر شیکھر نامی سائنس داں نے جو ہندوستانی تھا، ۱۹۳۰ء میں یہ خیال پیش کیا تھا۔ اس وقت وہ نوعمر تھا، اس نے کہا کہ بلیک ہول بننا ممکن ہے مگر اس کے لیے شرط یہ ہے کہ سیّارے میں مادے کی مقدار سورج کی مقدار مادہ سے کم از کم چالیس فیصد زائد ہو۔ اس وقت لوگوں نے سوچا کہ یہ نوجوان ان معاملات کو کیا جانے، چنانچہ اس کے تصورات کو ایک لمبے عرصے تک نظر انداز کیا گیا۔ بالآخر نصف صدی کے بعد تسلیم کر لیا گیا کہ اس نے جو اندازہ لگایا تھا وہ درست تھا۔

روایتی فہم کے مطابق بلیک ہول کی خصوصیات

تاہم یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اب تک کی تحقیق کے مطابق بلیک ہول کا ظہور ممکن ہے، لازم نہیں ہے۔ ابھی تک بلیک ہول صرف امکان کا نام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے کچھ شواہد موجود ہیں، مگر ان کی حیثیت ایسی نہیں کہ وہ یقینی کہے جا سکیں۔ ان مشاہدات کی تعبیر دوسرے طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے۔ بلیک ہول ایک ممکن حقیقت ہے، ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔ بہر حال ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بلیک ہول میں کیا ہوگا؟

بلیک ہول کی دو خصوصیات نمایاں ہیں: ایک یہ کہ اس کا حجم بڑا مختصر ہوگا، یعنی وزن تو بہت ہوگا (سورج کے وزن سے بھی چالیس فیصد زیادہ) لیکن حجم مختصر ہوگا۔ ہر مادی وجود میں ثقل کی بنا پر کشش موجود ہے، وہ اپنا کام کرتی ہے اور سیّارے کے حجم کو گھٹاتی ہے۔ چنانچہ بہت چھوٹی سی جگہ میں قعر اسود موجود ہوگا۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ بلیک ہول سے کوئی چیز

باہر نہیں جاسکتی۔ یہاں تک کہ روشنی بھی اندر چلی جائے تو واپس نہیں آئے گی۔ اس میں کوئی چیز گرے تو جذب ہوجائے گی، لیکن اس میں سے کوئی شے نکل جائے، ایسا ممکن نہیں ہوگا۔ گویا وہ ایک کھائی ہے، جس میں ہر چیز جو قریب آئے گی، گر جائے گی۔ اس سے باہر نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

بلیک ہول کا مقابلہ زمین سے کر سکتے ہیں۔ ہم سطح زمین سے اوپر کی جانب کوئی چیز پھینکیں تو وہ کچھ دور جائے گی، پھر واپس آجائے گی۔ اِلاّ یہ کہ آپ بہت تیز پھینکیں، یعنی ابتدائی رفتار بہت تیز ہو۔ اگر آپ کسی چیز کو چالیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سطح زمین سے اوپر کی جانب پھینکیں تو وہ زمین پر واپس نہیں آئے گی۔ مگر چالیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ بہت بڑی رفتار ہے۔ آواز کی رفتار صرف بارہ سو کلومیٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ آواز سے تیز سپرسونک طیارے بھی اب بن گئے ہیں جن کی رفتار پندرہ سو کلومیٹر فی گھنٹہ تک ہوسکتی ہے۔ مگر عام انسانی سواریوں کی رفتار زیادہ نہیں ہوتی۔ ان کے مقابلے میں چالیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ بڑی رفتار ہے۔ اس رفتار سے کوئی چیز دور پھینک دی جائے تب وہ زمین پر واپس نہیں آئے گی۔ لیکن بلیک ہول کا معاملہ مختلف ہے۔ آپ کسی بھی رفتار سے کوئی شے اس کی سطح سے دور پھینک دیں، بہرحال وہ واپس آجائے گی۔ بلیک ہول سے وہ بھاگ نہیں سکتی، اس کے دائرہ کشش سے روشنی بھی نہیں نکل سکتی۔ یہ اس کی دوسری خصوصیت ہے اس لیے بلیک ہول محققین کی دلچسپی کا باعث رہا ہے۔

ہاکنگ کی جدّت

بلیک ہول کی مذکورہ بالا خصوصیات روایتی سائنس پر مبنی ہیں۔ اس تناظر میں ہاکنگ نے نئی بات پیش کی جس کو اس نے عام فہم انداز میں اپنی کتاب Brief History of Time میں بیان کیا ہے۔ ہاکنگ نے کوانٹم نظریہ کا حوالہ دیا ہے، جس کے مطابق پیشگوئی یقینی نہیں ہوتی۔ چنانچہ یقینی پیشگوئی کی کوشش، کوانٹم نظریہ کے تخلیق کردہ سائنسی مزاج کے خلاف ہے۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ بلیک ہول سے کوئی چیز نہیں نکل سکتی، تو یہ ایک مطلق پیشگوئی ہے۔ ہاکنگ کہتا ہے کہ یقینا اس استدلال میں کوئی جھول اور کوئی کمزوری ہے، اس لیے کہ مطلق

پیشگوئی، نئے سائنسی رجحان سے ہم آہنگ نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ہاکنگ نے روس کا سفر کیا۔ روس کے ایک سائنس دان نے اس تضاد کی جانب ہاکنگ کو توجہ دلائی کہ یہ جو بات کہی جاتی ہے کہ بلیک ہول سے کوئی چیز نہیں نکل سکتی، کیا یہ مطلق دعویٰ کوانٹم نظریہ کے مطابق ہے؟ ہاکنگ کو اس سوال نے متاثر کیا اور اس نے بالآخر اپنی تحقیق کر کے نتیجہ نکالا کہ بلیک ہول سے متعلق یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ اس سے کوئی چیز باہر نہیں نکل سکے گی، بلکہ ہوگا یہ کہ بلیک ہول سے روشنی نکلے گی، البتہ اس اخراج کے امکانات کم ہوں گے۔ بتدریج ہی سہی، روشنی نکلتے نکلتے ایک ایسا وقت آئے گا کہ بلیک ہول کی توانائی ختم ہو جائے گی، یعنی وہ منتشر ہو جائے گا اور ایک جرم فلکی کے طور پر باقی نہیں رہے گا۔ بلیک ہول سے روشنی کے اخراج کو ہاکنگ ریڈی ایشن Hawking Radiation کہا جاتا ہے۔ روشنی توانائی کی ایک شکل ہے، چنانچہ ہاکنگ کا نظریہ اور تحقیق یہ ہے کہ قعر اسود سے توانائی خارج ہوگی۔

ہاکنگ کا یہ استدلال قوی ہے اس لیے کہ کوانٹم نظریے سے مطابقت رکھتا ہے۔ چنانچہ اب عموماً لوگوں نے اس استدلال کو تسلیم کر لیا ہے۔ پیش کردہ بنیادی دلیل کوانٹم نظریہ سے مستنبط ہے۔ البتہ ایک ثانوی دلیل بھی ہاکنگ نے پیش کی ہے، جو پرانی سائنس سے مستعار ہے۔ روایتی فزکس کا ایک باب 'حرارت کے قوانین' سے عبارت ہے۔ اس شعبے کو Themodynamics کہتے ہیں۔ حرارت کے قوانین کی نوعیت نیوٹن کے عام خیالات سے قدرے مختلف ہے، اگرچہ یہ قوانین روایتی فزکس کا حصہ ہیں۔ حرکیات کے ان قوانین میں امکان کا ذکر ہوتا ہے۔ زیر مشاہدہ ذرّات کی حرکت سے متعلق یقینی پیشگوئی نہیں ہوتی۔ حرارت کے قوانین پرانی سائنس کا جز ہیں۔ یہ بیسویں صدی سے پہلے ترتیب پا چکے تھے، تاہم ان میں اور کوانٹم نظریہ میں یہ امر مشترک ہے کہ دونوں کے مطابق ذرّات کی حرکت کی تفصیلی کیفیت کے سلسلے میں مستقبل کے تناظر میں یقینی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ہاکنگ نے دلیل کے طور پر دونوں کو استعمال کیا ہے۔ یعنی کوانٹم نظریہ اور حرکیاتِ حرارت کے قوانین کو۔ ہاکنگ کی اصل دلیل کوانٹم تصورات ہیں اور اس کے استدلال کا حاصل یہ ہے کہ بلیک ہول سے توانائی نکلے گی، حتیٰ کہ اس میں موجود توانائی بالآخر ختم ہو جائے گی اور اس کا بلیک ہول کے طور پر جداگانہ وجود باقی نہیں رہے گا۔ اس استدلال نے سائنس اور فزکس کی دنیا میں ہاکنگ کی

تحقیقات کو نمایاں مقام عطا کیا۔ اس کے تصورات کو لوگوں نے بڑی اہمیت دی اور اس کے استدلال کی قوت کو تسلیم کیا۔

ہاکنگ کے عام افکار

سائنسی تحقیق اور سائنس کے مقبول عام تعارف پر مشتمل کتابوں کی تصنیف کے علاوہ ہاکنگ نے کائنات کی ابتدا اور خدا اور کائنات کے تعلق پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ سائنس دانوں کے مابین کائنات کی ابتدا کے سلسلے میں دو نظریات مقبول تھے، جو بیسویں صدی میں پیش کیے گئے: ایک نظریہ یہ تھا کہ کائنات کی ابتدا ایک دھماکے سے ہوئی۔ اس خیال کو بگ بینگ تھیوری کہا جاتا ہے۔ گویا کائنات کا آغاز ایک نقطے سے ہوا۔ پوری کائنات کا مادہ جمع تھا، پھر کائنات پھیلنا شروع ہوئی۔ ابتدائے کائنات سے متعلق دوسرا تصور وہ تھا جس کو ہبل (Hubble) نے پیش کیا۔ وہ تصور یہ ہے کہ کائنات پھیل نہیں رہی، بلکہ اس میں تخلیق کا عمل مسلسل جاری ہے۔ بظاہر ہمیں کائنات پھیلتی ہوئی نظر آتی ہے، لیکن نئی تخلیق کے تسلسل کی بناء پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کائنات کا آغاز ایک نقطے سے ہوا۔

بقول اقبالؒ ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم، صدائے کن فیکون

جہاں تک مشاہدے کا تعلق ہے، شواہد پہلے تصور کے حق میں ہیں۔ تخلیق مسلسل کے نظریے کے حق میں کوئی شواہد پیش نہیں کیے جا سکتے۔ اس کے برعکس جب دُور کی کسی کہکشاں (Galaxy) کا مشاہدہ کیا جائے تو کائنات کا پھیلنا ایک حقیقت کے طور پر سامنے آتا ہے۔

پہلے تصور، یعنی ایک نقطے سے کائنات کے آغاز کو اہل تحقیق نے عام طور پر تسلیم کیا۔ ہاکنگ بھی اس کو تسلیم کرتا ہے، یعنی کائنات کی ابتدا ایک نقطے سے اور ایک دھماکے کے ساتھ ہوئی اور اب وہ پھیلتی چلی جارہی ہے۔ اس نے کائنات کے ارتقاء کے مختلف مراحل بھی بیان کیے ہیں۔ کتاب Brief History of Time میں ان مراحل کا تذکرہ ہے۔ تدریجاً کائنات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں؟ اور کس طرح ارتقاء ہوا؟ اس کو ہاکنگ نے بیان کیا ہے۔

تخلیق کائنات کے تذکرے کے بعد ہاکنگ خدا کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ جو

باتیں اس نے کہی ہیں وہ اسی قسم کی ہیں جیسی عام طور پر ملحدین کہتے ہیں۔ مثلاً ایک بات اس نے یہ کہی ہے کہ ہمیں خدا کے تصور کی ضرورت اس وقت تھی جب سائنس نے ترقی نہیں کی تھی اور ہم کائنات کی توجیہ کے لیے خدا کے تصور کا سہارا لیتے تھے۔ اب ہم سائنس کے حقائق و نظریات کو جانتے ہیں، اس لیے ہمیں خدا کے تصور کی ضرورت نہیں ہے۔ ملحدین کا یہ قول بالکل بچگانہ ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ کائنات کی سائنسی تشریح اصلاً اس سوال کا جواب ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کس طریقے اور کس ڈھنگ سے ہو رہا ہے؟ اس میں کارفرما قوانین کیا ہیں؟ اس کے برعکس جب ہم خدا کے وجود کے بارے میں پوچھتے ہیں تو وہ سوال ایک دوسری نوعیت کا ہوتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ ان فطری قوانین کو بنانے والا کون ہے؟ ان قوانین کو کام میں لا کر کائنات میں حسن، ترتیب اور تناسب کو قائم کرنے والا کون ہے؟

ملحدین کا قول

وجودِ خداوندی کے بارے میں مذکورہ بالا بات، جو ہاکنگ نے پیش کی ہے، ملحدین عموماً اس کو دہراتے رہتے ہیں۔ وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ اس گفتگو میں دو مختلف سوالات زیر بحث ہیں۔ ایک سوال مظاہر کائنات کے بیان (Description) سے متعلق ہے، جب کہ دوسرا سوال کائنات کی تعبیر (Meaning) سے متعلق ہے۔ کہنے والا یہ تو کہہ سکتا ہے کہ سائنس کی ترقی نے کائنات میں نظر آنے والے مظاہر فطرت کا (مبنی بر مشاہدات) بیان ہمارے سامنے پیش کر دیا، مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ سائنس نے کائنات میں حسن اور توازن کی موجودگی کی توجیہ بھی پیش کر دی ہے۔ بہرحال ہاکنگ کا ایک قول تو یہ ہے کہ ہمیں خدا کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ اب سائنس ترقی کر چکی ہے۔ دوسری بات اس نے یہ کہی کہ خدا تعالیٰ نے کائنات کے قوانین کو وجود بخشا ہے۔ غالباً یہ تصور صحیح ہے (یہ اسی طرح کی بات ہے جو نیوٹن نے پیش کی تھی کہ قوانین فطرت خدا کے بنائے ہوئے ہیں) البتہ ہاکنگ کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ براہ راست مداخلت کر کے (اپنے بنائے ہوئے) قوانین فطرت میں تبدیلی نہیں کرتا، یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ قوانین بنا دینے کے بعد پھر وہ کائنات کے ارتقاء میں (بطور مدبر) مداخلت کرے اور مداخلت کی صورت یہ ہو کہ کائنات میں نافذ قوانین میں تبدیلی ہو جائے۔ یہ ہاکنگ کا قول ہے۔ (جاری ہے)

کس قیامت کے یہ نامے

مولانا مودودیؒ۔علم وفضل کے پیکر

محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب

مولانا مودودیؒ کی فکر کے حوالے سے البرہان میں آپ کا مضمون خرد افروزی اور علمی وفکری اختلاف کا اعلیٰ نمونہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آپ اور پروفیسر ملک محمد حسین صاحب جماعت اسلامی کی اصلاح کے لیے جو کوشش کر رہے ہیں وہ نہایت مستحسن ہیں اور اس بہی خواہی پر جماعت کو آپ کا ممنون ہونا چاہیے۔

بلاشبہ مولانا مودودیؒ اپنے عہد کے ایک بڑے مفکر تھے تاہم وہ حریت فکر کے قائل تھے اور اگر آج وہ زندہ ہوتے تو آپ کی تحریر پر ان کا رویہ یقیناً وہ نہ ہوتا جس کا اظہار ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے کیا ہے۔مولانا یا جماعت کی فکر سے اختلاف یا اس پر اچھے اور محتاط انداز میں علمی تنقید ہرگز اس قابل نہ تھی کہ اس پر مشتعل ہوا جاتا۔محترم ہاشمی صاحب کا جو علمی امیج میری نظروں میں تھا وہ ان کی تند و تیز تنقید پڑھ کر مجروح ہوا۔میں خود رکن جماعت ہوں اور پروفیسر ہوں اور مجھے مضمون اتنا پسند آیا کہ مَیں نے اس کی فوٹو کاپیاں دوستوں میں تقسیم کیں۔سوال یہ ہے کہ اگر ہمارا رویہ بھی مسلکی مقلدین جیسا ہو جو سمجھتے ہیں کہ ان کے امام صاحب سے غلطی نہیں ہو سکتی اور ان کا ہر قول مقدس ہے،تو پھر ہم میں اور ان میں فرق کیا رہا؟

(پروفیسر) عبداللہ رحمانی، کراچی

محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب!

میں ان بہت سے لوگوں میں سے ایک ہوں جن کا البرہان کے ذریعے آپ سے تعارف ہوا اور مَیں آپ کو جماعت اسلامی کا ہمدرد اور خیر خواہ اور مولانا مودودیؒ کا محب اور قدردان سمجھتا رہا ہوں لیکن جنوری ۲۰۱۹ء کے البرہان میں آپ کے مضمون سے ایسا لگا جیسے آپ مولانا مودودیؒ کے زبردست مخالف ہیں اور ان سے بغض وعناد رکھتے ہیں۔کیا آپ میرے تاثر کی تائید یا تردید کرنا چاہیں گے؟

مجیب الحق، راولپنڈی

جواب

آپ کا تاثر درست نہیں ہے۔ مَیں فی الواقع جماعت اسلامی کا خیر خواہ اور ہمدرد ہوں اور اسے کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مَیں مولانا مودودیؒ کے تبحر علمی اور فکری عظمت کا معترف اور قدردان ہوں اور ان کی جدوجہد کے مفید اور تعمیری اثرات کا قائل ہوں۔ مجھے ان کی بہت سی باتوں سے اتفاق ہے تاہم ان سے کچھ علمی اختلافات بھی ہیں۔ اگر آپ مندرجہ ذیل نکات کو پیشِ نظر رکھیں تو میرا مؤقف سمجھنے میں آپ کو آسانی ہوگی:

۱۔ مَیں اس چیز کا قائل ہوں کہ علمی اختلاف کا اظہار نرم الفاظ میں شائستگی اور متانت سے کرنا چاہیے۔ مجھے جماعت کے کچھ دوستوں نے توجہ دلائی ہے کہ میرے جنوری ۲۰۱۹ء والے مضمون میں مولانا کے بارے میں کچھ الفاظ ایسے تھے جن سے ان کو شدید دُکھ پہنچا ہے اور یہ کہ میرے مضمون کا لہجہ سخت اور کھردرا تھا۔ مَیں اپنے ان دوستوں سے معذرت خواہ ہوں جن کو میرے الفاظ سے رنج پہنچا۔ مَیں ان شاء اللہ آئندہ کوشش کروں گا کہ اپنی رائے کا اظہار نرمی اور شائستگی سے کروں اور کسی کی دل شکنی کا سبب نہ بنوں۔

۲۔ میرے علم میں ہے کہ جماعت میں اس وقت فکری لحاظ سے اضطراب اور عدم یکسوئی ہے اور جماعت میں ہزاروں کارکن ایسے ہیں جو جماعت کی موجودہ سیاسی انتخابی پالیسی سے غیر مطمئن ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جماعت کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جماعت میں بہت سی اخلاقی اور سیاسی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں.... لیکن ان کا دھیان اس طرف نہیں جاتا کہ اس کے اسباب فکری بھی ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح جماعتی قیادت سے اگر جماعت کی ناکامیوں پر شکوہ کیا جائے تو وہ جماعت کی سیاسی انتخابی جدوجہد میں اصلاحی تجاویز طلب کر لیتی ہے لیکن وہ سیاسی انتخابی جدوجہد سے دستبردار ہو کر کسی متبادل فکری منہاج پر غور کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ کہ جماعت کے اندر یہ دونوں نقطہ ہائے نظر مولانا کی فکر کو Rethink کرنے کو تیار نہیں اور اگر ہم جیسا کوئی طالب علم اس کی جسارت کرے تو اسے پتھر پڑتے ہیں۔ ہمارا

مضمون پڑھ کر ایک صاحب اتنے مشتعل ہوئے کہ کہنے لگے کہ آپ نے مولانا مودودیؒ کو گالی دی ہے۔ ایک اور صاحب کہنے لگے کہ آپ ہیں کون؟ اور آپ کی حیثیت کیا ہے؟ کہ مولانا مودودیؒ پر تنقید کریں؟

ہم کہتے ہیں کہ جماعتی احباب کو اس معاملے میں مولانا مودودیؒ کے طرز عمل کی پیروی کرنا چاہیے۔ مولانا نے دستور جماعت میں لکھوایا کہ اللہ ورسول کے سوا کوئی تنقید سے بالاتر نہیں۔ 'خلافت وملوکیت' میں انہوں نے حضرت عثمانؓ کے طرز عمل سے اختلاف کیا۔ 'تجدید واحیائے دین' میں امام غزالیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ پر تنقید کی تو کوئی دوسرا شخص اگر مولانا محترم کے علم وفضل کا اعتراف کرنے کے ساتھ ان سے کسی علمی رائے میں اختلاف کرے تو اسے جرم کیوں سمجھا جائے؟ اور اسے مولانا محترم کی ہتک کیوں گردانا جائے؟

۳۔ دراصل ہمیں اس امر کا شعوری ادراک کرنا چاہیے کہ دور متاخرین میں عدم اجتہاد اور علمی تحریک میں کمی کی وجہ سے تقلید کا رویہ اہل علم میں بھی پختہ ہوگیا۔ اس چیز نے مسلک پرستی اور فرقہ واریت کو جنم دیا اور لوگوں نے اپنے اپنے امام کی رائے کو مقدس، حتمی اور ناقابل تغیر سمجھنا شروع کر دیا لیکن ہم حیرت سے دیکھتے ہیں کہ خود ان ائمہ کرام کا رویہ ایسا نہ تھا۔ امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ میں سے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کثرت سے ان سے اختلافِ کرتے تھے لیکن امام صاحب نے کبھی اس کا بُرا نہیں مانا لیکن آج اگر کوئی ادب سے بھی امام ابوحنیفہؒ کی کسی رائے سے اختلاف کرے تو اسے پتھروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ہم جماعتی احباب کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم جماعت کے بہی خواہ ہیں اور مولانا مودودیؒ کا بہت احترام کرتے ہیں لیکن اس احترام کا مطلب یہ نہیں سمجھتے کہ ان سے علمی اختلاف کرنا جرم ہے۔ اہل علم سے ہماری گزارش ہے کہ وہ بڑی دینی تحریکوں جیسے جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت (جنہیں قائم ہوئے ایک صدی ہونے کو ہے) اور بڑے دینی اداروں جیسے دینی مدارس ہیں، جنہیں قائم ہوئے ڈیڑھ صدی گزر چکی ہے اور حالات بھی تبدیل ہو چکے ہیں، ان کے قائدین اور مفکرین ومصلحین کی فکر کو Revisit اور Rethink کریں یعنی اس پر نظر ثانی کریں اور اس کی تجدید کریں تاکہ ان جماعتوں اور اداروں کو مزید فعال اور مثمر بنایا جاسکے اور امت زوال کی دلدل سے جلد نکل سکے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین.